ہندوستان کے محکمہائے تعلیم میں منظور شدہ
ADABI DUNYA
The Premier Urdu Monthly
اُردو کا علمی و ادبی ماہوار
رسالہ
ادبی دُنیا
نقشۂ عالم کے مندرجہ ممالک تک ہندوستانیوں کے ساتھ اُردو زبان پہنچ چکی ہے
مشرق و مغرب کے جدید و قدیم ادبیات کا مُرقع
SEPT.
1933.
آنریری ایڈیٹر
مولانا تاجور نجیب آبادی
ایڈیٹر
منصور احمد

فہرستِ مضامین "ادبی دنیا" لاہور

جلد ۸ بابت ماہِ جولائی ۱۹۳۲ء نمبر ۴

تصاویر:- دولت کی دُھن - مثنوی سحرالبیان کا ایک منظر

(ایم ہادی حسن اختر پرنٹر و پبلشر نے مسلم پرنٹنگ پریس سرکلر روڈ لاہور میں چھاپ کر ایشر داس بلڈنگ میکلوڈ روڈ - لاہور سے شائع کیا)

حال و قال

مُبارک باد - قارئینِ ادبی دنیا یہ نویدِ جانفزا سُن کر خوش ہونگے - کہ ادبی دنیا کے سب سے بڑے قدر شناس، ملک و ملت کے محترم، نواب مسعود جنگ بہادر، ڈاکٹر سر سید راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کو حکومت کی جانب سے اعترافِ عظمت کے طور پر سر کا خطاب ملا ہے۔

راس مسعود کے قومی ایثار، اہم ملی خدمات نے اُنہیں عظمت و اعزاز کے اُس بلند زینے پر پہنچا دیا ہے جہاں صنعتی اعزاز و احتشام بے ضرورت بن جاتا ہے۔ اِس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ اِس خطاب نے راس مسعود کی عظمت میں کوئی اضافہ کیا ہے یا اُن کی نسبت اس کے لئے باعثِ فروغ ہوئی ہے۔ لیکن مسرت اِس امر کی ہے کہ ہمارا قومی رہنما ملت و حکومت دونوں کی نظر میں یکساں قابلِ احترام ہے۔

گریہ پسِ خندہ - بقول شخصے "جب کوئی ہنسا ساتھ ہی آنسو نکل آئے"۔ مذکورہ بالا بشارت کو سننے کے ساتھ ہی کچھ متواتر حسرتیں بھی نصیبِ دوستاں بن چکی ہیں۔ یہ سال ہماری قوم کے لئے اِس حیثیت سے سخت جاں گسل واقع ہؤا ہے کہ ایوانِ ملت کے بڑے بڑے ستون موت کے ہاتھوں سے منہدم ہو گئے۔

مسلم رہنماؤں میں - سر علی امام، حسن امام، سر سید فخر الدین، نواب سر ذوالفقار علی خان -

علماء میں - اُستاذی مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃُ اللہ علیہ -

اُدباء میں - نواب حیدر یار جنگ بہادر، علامہ سید علی حیدر طباطبائی - خان بہادر میر ناصر علی ایڈیٹر "صلائے عام" دہلی کا انتقال کس درجے حواس پاش ہے - یہ وہ عالی جاہ حضرات ہیں جن کا کوئی صحیح جانشین اِس وقت نہیں ہے - آہ

"الارضُ تبقیٰ وَالاَخِلاّءُ تذہب"

تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ - پنجاب یونیورسٹی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ شائع ہو گئی ہے - اِس کمیٹی سے صوبے کی بہت کچھ توقعات وابستہ تھیں مگر افسوس ہے کہ یہ خواب بھی کثرتِ تعبیر ہی کی نذر ہو گیا ہے - فرقہ وارانہ سیاسی سازشوں نے اپنے آخری اثرات سے کام لے کر اس خالص علمی سوال کو بھی سیاسی جولانگاہ بنا دیا" العہدۃُ علی الرواۃ" "ہزار مُنہ ہیں ہزار باتیں"

لیکن ایک بات ناقابلِ انکار ہے کہ سر جارج اینڈرسن مسلم یونیورسٹی کمیشن کے ممبر کی حیثیت سے جو چھان پھٹک کر کے آئے تھے پنجاب یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے اُنہوں نے اُس جرأت و غیر جانبداری کا عشرِ عشیر بھی مظاہرہ نہ کیا۔ ضرورت تھی کہ یونیورسٹی کے اسٹاف میں سے غیر ضروری اور ناقابل عنصر کو خارج کیا جاتا، یونیورسٹی کے ملازمین

کی غیر آئینی حرکات کی چھان بین کرکے آئین شکن ملازموں کو پولیس کے سپرد کیا جاتا، موجودہ رجسٹرار کی روایتی خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر اُن کے تقرر پر نظر ثانی کی جاتی، سنڈیکیٹ کے ٹھیکیداروں کے زرین ماضی وحال کا بغور مطالعہ کیا جاتا اور اُن کے درخشاں کارناموں کو عبرت آموز نظارہ بنایا جاتا، کورس مرتب کرنے والوں کی اہلیت و نااہلیت کا اندازہ کرکے اِس سلسلے میں حفاظتی تدابیر اختیار کی جاتیں، یونیورسٹی کا گریبان ایسے وُکلا کے پنجۂ آہنی سے چھڑایا جاتا جن کی قانونی قابلیتوں سے پبلک نے استفادہ غیر ضروری سمجھ رکھا ہے۔ اِس شکست و ریخت کے بعد ضروریاتِ زمانہ اور آزاد پنجاب کے تعلیمی مستقبل کو دیکھتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی کے لئے کوئی ایسا مکمل دستور العمل ترتیب دیا جاتا جو ایک ترقی یافتہ صوبے کی تعلیمی ضروریات کو پُورا کرسکے۔ لیکن ہُوا کیا؟ سچ یہ ہے کہ جو کچھ ہُوا ہے نہ ہونے کے برابر ہے۔ سُنا جاتا ہے کہ ہزایکسیلنسی گورنر پنجاب نے رپورٹ کو ملاحظہ فرماکر اِس ایک فقرے میں اس پر تبصرہ فرمادیا ہے کہ "حکومت کا ساٹھ ہزار روپیہ بیکار ضائع ہُوا"۔ عمائد پنجاب اِس رپورٹ سے غیر مطمئن ہیں ۔

رومن رسم الخط کو رائج کرنے کی تجویز۔ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی اِس تجویز کو پسند کیا گیا ہے کہ دسویں جماعت تک ذریعۂ تعلیم دیسی زبانیں قرار دی جائیں مگر اُن کیلئے رسم الخط رومن ہو۔ اخبار "ملاپ" میں ایک آریہ سماجی پروفیسر نے اِس بدیشی تجویز کی تائید کی ہے اور ساری ہندو قوم کو اس پر اُکسایا ہے کہ وہ پنجاب میں رومن رسم الخط کے رواج کی تائید کریں۔ خیر یہاں تک تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی لیکن اس تائید کی جو وجہ اُنہوں نے بیان کی ہے وہ اُنکی قومی ذہنیت کی پستی کو بے نقاب کر دیتی ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں کو متفقہ طور پر ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کی اِس تجویز کی تائید کرنی چاہیئے، کیونکہ پنجاب میں اُردو عدالتوں اور تعلیمات پر چھائی ہوئی ہے۔ یہاں نہ تو ہندی فروغ پاسکتی ہے نہ گورمکھی، اِس لئے اُردو کو مٹانے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی کہ ہندو اور سکھ رومن رسم الخط کو منظور کرلیں۔ یہ پروفیسر فرماتے ہیں کہ ہمیں لالہ لاجپت رائے کے مقولے پر عمل کرنا چاہیئے کہ

"نہ کھائیں گے نہ کھانے دیں گے"

ہندو قوم کو اس سُنہری موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے رومن رسم الخط کی پُرزور تائید کرنی چاہیئے (وغیرہ ذالک من الهفوات)

جن نوجوانوں کی تعلیمی قسمت ان جیسے برگزیدہ اساتذہ کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے اُن کا بس خدا ہی حافظ ہے۔

اِسی ذہنیت کے ظالمانہ اقتدار نے اِس ترقی یافتہ زبان (اُردو) کو جو ہندوستان میں مختلف قوموں، فرقوں اور تہذیبوں کے اختلاط کی ایک شاندار یادگار ہے اپنی جنم بھومی (صوبجاتِ متحدہ) اور صوبۂ بہار سے تقریباً مٹا دیا ہے! ور جس صوبے میں اس کا بس نہیں چلتا وہاں دوسری غیر مسلم قوموں سے ساز باز کرکے اسے مٹانے کی فکر میں لگی رہتی ہے۔

راقم الحروف کا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانیں اور تمام تہذیبیں قابلِ عظمت ہیں ہر ہندوستانی کا فرض ہے

کہ انہیں ترقی دینے اور زندہ رکھنے کی امکانی کوشش سے دریغ نہ کرے۔

اُردو بھی ہماری اور ہندی بھی ہماری، ہم ان دونوں سے پریم رکھتے ہیں۔ ہمیں ان دونوں کو ترقی دینے اور زندہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اُردو کی لاش پر ہندی کی تعمیر کے خواب درحقیقت بدہضمی کی بدخوابیاں ہیں۔

ہم اُردو رسم الخط کو مٹانے کے لئے رومن رسم الخط کو ہرگز رواج پذیر نہ ہونے دیں گے۔ یوں جس کا جی چاہے زندگی بھر رومن رسم الخط میں نوشت و خواند کرتا رہے، اُسے کوئی روکنے والا نہیں۔ لیکن یاد رکھو! اُردو کو مٹانے کے لئے یہ ذلیل سازشیں پنجاب میں کمل ڈالی جائیں گی۔ یہ ہماری رواداری ہے کہ ہم اِس صوبے میں ہندی کو اُردو کے ساتھ لگائے ہوتے ہیں، اور بہار و یوپی کی اُردو دشمنی کا انتقام نہیں لے رہے۔ اِس رواداری کو ہماری کمزوری یا غفلت پر محمول کرکے کچھوے کے سے پاؤں نکالنا گستاخی میں داخل سمجھا جائے گا اور گستاخی کی کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اس سے قطع نظر ہم ان پروفیسر صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اُردو کو مٹانے کے لئے سکھ بھائیوں کو اُکسانے کی بجائے کیا یہ امر قرینِ حیا و خودداری نہ ہوگا کہ پہلے اپنی قوم کے اُردو اخبارات، اور اُردو کتابوں، کو ہندی میں تبدیل کرنے کی مہم جاری کی جائے، اور اپنے پبلشروں اور مصنفوں کے ہاتھ میں گنگا جل دے کر اُن سے یہ عہد لے لیا جائے کہ ہم آیندہ اُردو کی ایک سطر بھی لکھنا دھرم کے خلاف سمجھیں گے۔ قولِ بے عمل کی تو کوئی قیمت نہیں، مگر میں پروفیسر صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ گئو رکھشا کے مجاہدوں نے جب چرمی کاروبار شروع کرنے میں دھرم اور رفقا کی پروا نہ کی تو وہ اِس معمولی سے زبان کے مسئلے میں آپ کے شور و غوغا پر توجہ ضائع کرنا اُصولِ تجارت کے خلاف سمجھیں گے۔

تاجور

"ادبی دُنیا" کا سائز اِس مہینے سے تبدیل ہو رہا ہے۔ ہمارے تمام دوستوں نے اِس تبدیلی کو پسند کیا ہے، اور معاونین میں سے بھی اکثر نے ہماری اِس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ اِس سائز میں موزونیت زیادہ ہے۔ جیسا کہ تفصیل کے ساتھ گذشتہ پرچے میں لکھا جا چکا ہے ہم نے رسالے کے صفحات بڑھا دیئے ہیں، قلم باریک کر دیا ہے، اور گذشتہ معمول کے خلاف ہم ہر سال ایک ضخیم سالنامہ بھی دیا کریں گے۔ اِس کے ساتھ ہی ہم نے "ادبی دُنیا" کی قیمت میں تھوڑی سی رعایت بھی کر دی ہے۔ اب سالانہ چندہ پانچ روپے چار آنے کی بجائے پانچ روپے دو آنے ہوگا اور قیمت فی پرچہ ساڑھے چھ آنے کی بجائے چھ آنے۔

آئینۂ عالم

مجھے یہودیوں سے کیوں نفرت ہے

جرمنی کے قائدِ اعظم ہٹلر کی کتاب "جدوجہد" کا ایک اقتباس

میرے لئے آج یہ بتانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کہ لفظ "یہودی" نے سب سے پہلے کب میری توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا۔ جب تک میرے والد زندہ رہے مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی اُن کے منہ سے یہ لفظ سُنا ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہودی نسل کے متعلق وہ کسی قسم کی رائے بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جب میں پندرہ برس کا ہوا تو مجھے کئی موقعوں پر اس لفظ کے سننے کا اتفاق ہوا۔ یہ اتفاق اکثر ہماری لڑکپن کی سیاسی گفتگوؤں کے دوران میں ہوتا تھا۔ میں کبھی یہ نہ سمجھ سکا کہ کیوں ہر دفعہ مذہبی جھگڑے اُٹھ کھڑے ہونے پر مجھے ایک عجیب بیزاری کا سا احساس ہوتا تھا۔

لِنز میں جہاں میں نے اپنی جوانی کا ایک حصہ گزارا چند یہودی رہتے تھے۔ صدیوں کی بود و باش کی وجہ سے اُن کی شکل و صورت بالکل یورپ کے لوگوں کی سی ہوگئی تھی، اور اُن میں اجنبیت کی کوئی بات باقی نہ رہی تھی۔ میں ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ یہ جرمن ہیں۔ خبر نہیں میرے اِس بے معنی خیال کی کیا وجہ تھی۔ میں سمجھتا تھا اُن میں اور ہم میں صرف مذہب کا فرق ہے، اور صرف مذہب کے لئے اُنہیں ستایا جاتا ہے۔ جب اُن کو بُرا بھلا کہا جاتا تو مجھے سخت ناگوار ہوتا۔ مجھے اِس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اِسی قسم کا بلکہ اِس سے بھی بڑھ کر وحشیانہ پن یہودیوں میں بھی موجود ہے۔

اس کے بعد میں وائنا چلا گیا۔ اپنے قیام و بقا کی روزانہ مصروفیات کی وجہ سے پہلے پہل شہر کی مختلف المذہب آبادی کی طرف میں نے توجہ نہ کی۔ اُس وقت وائنا کی بیس لاکھ کی آبادی میں سے تقریباً دو لاکھ یہودی تھے۔ ایک طویل عرصے تک میں نے اُن کو نہ دیکھا، لیکن ایک دن جب میں قلبِ شہر میں چکر لگا رہا تھا میں نے ایک شخص کو لمبا سیاہ چُغہ پہنے ہوئے دیکھا۔ میرے دل میں خیال آیا "کیا یہ یہودی ہے؟ لِنز میں تو یہودی اس قسم کے نہ ہوا کرتے تھے۔" میں نے اس شخص کو غور سے دیکھنا شروع کیا، اُس کے چہرے کے نقوش کا مطالعہ کرنے لگا۔ دوسرا خیال جو میرے دل میں آیا یہ تھا کہ "کیا یہ جرمن ہے؟" اور جیسا کہ ایسے حالات میں اکثر ہوتا ہے میں نے اپنے شکوک کو رفع کرنے کے لئے مطالعہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے چند شلنگ خرچ کر کے

ایک کتاب خریدی جس میں سامیت کی مخالفت کی گئی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ کتاب اُن لوگوں کے لئے لکھی گئی تھی جو یہودی مسائل سے پہلے ہی اچھی طرح واقف ہوں۔ اِس کے علاوہ اسکے لہجے اور غیر معتبر طرزِ بیان نے مجھے پھر شک میں ڈال دیا +

اسی دوران میں یعنی جب میں مسئلۂ یہود کے حل کرنے میں مصروف تھا وائنا کو میں نے ایک اور ہی رنگ میں دیکھا۔ جہاں میں جاتا تھا مجھے یہودی ہی یہودی نظر آتے تھے، اور جتنا زیادہ میں اُن کو دیکھتا تھا اُتنا ہی میری آنکھیں اُن کو دوسرے لوگوں سے امتیاز کرنے کی عادی ہوتی جاتی تھیں۔ اب اگر میرے کچھ شکوک باقی رہ گئے تھے تو یہودیوں کے ایک فرقے نے اُن کو رفع کر دیا۔ یہ حقیقت کہ مذہبی اور غیر مذہبی یہودیوں کے درمیان ایک بُعدِ عظیم ہے مجھے سخت پریشان کرتی تھی۔ یہ فرقہ کلیتہً جھوٹا، غلط کار اور اُس راست بازی اور بلند اخلاق سے معرا تھا جو اس قوم سے منسوب کی جاتی ہے۔ مَیں نے فیصلہ کیا کہ مَیں یہودیوں میں رہ کر اُن کا مطالعہ کروں گا +

اخبارات میں، آرٹ میں، ادبیات میں اور ڈرامے میں غرضکہ جہاں کہیں مَیں نے ان کا مطالعہ کیا مجھے اُن کے خلاف اُس خطرناک ترین الزام کا ثبوت ملا جو اُن پر عائد کیا جاتا ہے۔ سینما اور تھیٹر کی دنیا میں اُن کے اشتہاری اعلانات سے اُن کے وحشیانہ پن کی تصدیق ہوئی۔ یہ ایک وبا تھی، ایک اخلاقی وبا، اُس تاریخی وبا سے زیادہ خطرناک جس نے لاکھوں نفوس کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ اور یہ قدرتی بات ہے کہ آرٹ کی چیزوں کا رُوحانی و اخلاقی معیار جتنا پست ہوتا جاتا ہے اُتنی ہی اُن کی پیداوار بڑھتی ہے +

وائنا کی گلیوں میں مجھ پر زبردست انکشاف ہوئے۔ شاید جنوب کی چند فرانسیسی بندرگاہوں کو چھوڑ کر اُس وقت یہ مقام یہودیوں کی بدکاری اور بردہ فروشی کا مطالعہ کرنے کے لئے بہترین جگہ تھی۔ ہر شام یہاں ایسے نظارے دیکھنے میں آتے تھے۔ جنہیں جرمن لوگ تقریباً ہمیشہ نظرانداز کر دیا کرتے ہیں۔ جب میں نے پہلی مرتبہ یہودیوں کو اس منظم طریق پر اور تاجرانہ سرگرمی کے ساتھ اِس عظیم الشان شہر میں بدکاری کرتے دیکھا تو میرا بدن کانپ گیا۔ اُس وقت مجھے اُن پر طیش آنا شروع ہؤا۔ اور جب مجھے یہ معلوم ہؤا کہ یہودی ایک چھپا ہؤا اشتراکی ہے تو میری آنکھوں کے آگے سے پردے اُٹھنے شروع ہوگئے +

آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوتا گیا کہ اشتراکی پریس کی تنظیم ہمیشہ یہودیوں کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ مَیں نے وہ تمام اشتراکی رسالے جمع کئے جو مجھے مل سکے اور اُن ناموں پر ایک نگاہ ڈالی۔ سب کے سب یہودی تھے۔ سچ یہ ہے کہ اُس وقت مجھے معلوم ہؤا کہ کس طرح ہماری قوم کو دھوکا دیا جاتا ہے +

عوام کو ایسی تحریکوں سے بچانے کے لئے وقت اور صبر کی ضرورت ہے لیکن ایک یہودی کی رائے کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ اب میں اس قابل ہو گیا تھا کہ یہودیوں پر اُن کی رائے کے بے معنی پن کو ظاہر کر سکوں۔ لیکن جتنے زیادہ مَیں اُن کو دلائل دیتا

تھا اتنا ہی مجھے اُن کے طریقِ بحث کا علم ہوتا جاتا تھا۔ ابتدا ہی سے وہ اپنے مدِ مقابل کو غبی سمجھنے لگتے ہیں اور اگر وہ اچھی طرح اُس سے بحث نہ کر سکیں تو اُسے بیوقوف بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر یہ طریقہ کامیاب ہوتا نہ دیکھیں تو ایسا ظاہر کرتے ہیں گویا وہ ہمارے دلائل کو سمجھ نہیں سکے، اور یکایک کوئی دوسرا موضوع بدل لیتے ہیں۔ وہ مسلّم الثبوت صداقتیں پیش کرتے ہیں اور اُن کی بنیاد پر ایک بالکل مختلف عمارت کھڑی کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اُن کے نام نہاد "حقائق" کا تار و پود بکھیر دیں تو وہ اپنی ساری منطق بھول جاتے ہیں ۔

اُن کے درمیان میں ایک احمق معلوم ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے اُن سے نفرت ہوتی گئی۔ اس کے علاوہ میں نے کارل مارکس کی تمام کتابیں پڑھی تھیں اور نہایت ٹھنڈے دل سے یہودیوں کی سرگرمیوں پر غور کیا تھا، اس لئے میں اُن کو خوب سمجھنے لگا تھا۔ یہودیوں کی مارکسی تعلیم قدرت کے اصولِ شرافت کو تباہ کر کے اُس کی جگہ زور و قوت کو اور عوام کالانعام کی فوقیت کو دیتی تھی۔ یہ انسان کی شخصیت کی قدر و قیمت کو نظر انداز کرتی تھی اور قومی اور نسلی اہمیت کو وجہِ امتیاز قرار دیتی تھی ۔

اگر یہودیوں نے اپنی مارکسی تعلیم کی مدد سے اس دنیا کے باشندوں پر فوقیت حاصل کر لی تو اس کا مطلب انسانیت کی موت اور دُنیا کی بربادی ہوگا۔ لیکن فطرت اپنے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں سے نہایت شدت کے ساتھ انتقام لیتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ آج میں یہودیوں کی قوت کے خلاف جنگ کر رہا ہوں ۔

رُوسی اخبارات

روس کے اخبارات آجکل ایک عجیب چیز بن رہے ہیں۔ بیرونی خبریں صرف اس حد تک ہوتی ہیں کہ اُن کا اختصار کر کے اُنہیں کسی آخری صفحے پر درج کر دیا جاتا ہے۔ اخبار کے مضامین زیادہ تر صنعتی تبصروں اور پیش ناموں پر مشتمل ہوتے ہیں جن میں اکثر شائع ہونے سے مہینوں پہلے لکھے جاتے ہیں۔ جرائم کی اطلاعات تقریباً بالکل مفقود ہوتی ہیں ۔

"ازوسیتیا" (الاخبار) غالباً رُوس کا سب سے مشہور سوویٹ اخبار ہے۔ تمام دوسرے رُوسی اخباروں کی طرح یہ بھی چار صفحوں کا ایک ورق ہوتا ہے اور ظاہری طور پر اس کا امتیازی نشان اس کے صفحے کا سائز ہے جو "ٹائمز" سے کچھ ہی بڑا ہے لیکن "پریوڈا" کے سوا دوسرے تمام روسی اخبارات سے بہت بڑا ہے ۔

ایڈیٹر کی بجائے اس کا ایک ایڈیٹوریل بورڈ ہے جس میں کارل ریڈک کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اگرچہ وہ سب سے زیادہ بارسوخ رکن نہیں۔ دوسرے ارکان اہم ترین شعبہ جاتِ حکومت کے اعلیٰ افسر ہیں جو اپنے فارغ اوقات کو ادارت کے کام میں صرف کرتے ہیں ۔

ادارتی کام نو شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر شعبہ ایک الگ قسم کی خبروں کی فراہمی کا ذمہ دار ہے۔ مثلاً صنعتی، زراعتی

اور بیرونی خبریں، کھیل، سائنس، اشتراکی جماعت اور اتحاداتِ تجارتی کی نسبت معلومات بہم پہنچانے کے لئے الگ الگ شعبے قائم ہیں ٭

ہر ایک شعبے کے لئے اخبار کے صفحات میں جگہ مقرر کر دی گئی ہے۔ اگر کسی ایک شعبے کا مضمون مقررہ حد سے بڑھ جاتا ہے تو اُسے دوسرے شعبوں سے جگہ مانگ تانگ کر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ خبریں بہم پہنچانے کا کام آسانی کے ساتھ تصحیح کے کام سے تبدیل ہو سکتا ہے۔ ایک خبر رساں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ نائب مدیر کا کام بھی انجام دے سکے گا۔ اگر کوئی رپورٹ بہت زیادہ لمبی ہو تو شعبہ کا افسر بتا دیتا ہے کہ اس میں اس طرح ترمیم و تنسیخ کر دی جائے۔ اگر کوئی شخص کبھی خبریں بہم پہنچانے کے لئے باہر نہ جائے تو وہ دفتر میں بیٹھ کر تار اور خطوط وغیرہ لکھتا ہے ٭

"ازویسٹیا" کی نشر و اشاعت کے لئے دفتر کو کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ پرچے مشین سے نکل کر خود بخود اُوپر کی منزل میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں ڈاک خانہ ہے۔ تمام پرچے کے تقسیم کرنے کا ذمہ وار ڈاک خانہ ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں اخبار کی ترسیل کے لئے ریل، ہوائی جہاز، اُونٹ، برف پر چلنے والی گاڑیاں غرض کہ ہر وہ ذریعہ جو اس سلسلہ میں کام آسکتا ہے وہ استعمال کرتا ہے ٭

اخبار کی کُل اشاعت ساڑھے سولہ لاکھ ہے۔ صرف "پراودا" کی اشاعت اس سے زیادہ ہے۔ "ازویسٹیا" والے یہ دیکھ کر جلتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا پرچہ اس لئے کم چھپتا ہے کہ ہمیں کاغذ کافی مقدار میں نہیں ملتا۔ اور اس کے ذمہ وار اشتراکی ہیں جو اپنے پرچے کی طرف زیادہ خیال رکھتے ہیں اور ضرورت کے مطابق کاغذ مہیا نہیں کرتے۔ "ازویسٹیا" کا صرف ایک مقامی ایڈیشن لینن گراڈ سے نکلتا ہے۔ جس کے لئے چھاپے کے حروف جوڑ کر ہوائی جہاز کے ذریعہ ماسکو میں بھیجے جاتے ہیں۔ اب انتظام ہو رہا ہے کہ اخبار کے صفحات کا عکس ٹیلی فوٹو کے ذریعہ سے لینن گراڈ میں لیا جائے ٭

منصور احمد

دولت کی دُھن ۔مشہور جرمن مصور روڈلف ہن برگ کی بلیغ اور پُرحکمت تصویر ہے، جو جرمنی کے قومی تصویر خانے کی زینت ہے۔ دولت کی دیوی پانی کے ایک بُلبلے پر سوار نہایت سُبک اور تیز رفتار سے جا رہی ہے اور ایک دولت کا دیوانہ بے تحاشا اُس کے پیچھے اپنا گھوڑا دوڑا رہا ہے۔ اُسے کسی کی جان کی پروا نہیں۔ ایک عورت اس کے گھوڑے کی لپیٹ میں آکر روندی جا رہی ہے۔ اسے اپنی جان کی پروا بھی نہیں۔ جس رستے سے وہ گزر رہا ہے وہ نہایت تنگ اور خطرناک ہے۔ ذرا سی لغزش سے ہر لحظہ اس کے دائیں بائیں گر جانے کا اندیشہ ہے۔ موت اپنا سیاہ گھوڑا اس کے ساتھ ساتھ بھگا رہی ہے ٭

بہت سے لوگ کہا کرتے ہیں کہ معلمی کا کام کرنے والوں کے دل نہیں ہوتا اور ہوتا بھی ہے تو پتھر کا۔ یہ ایک حدتک صحیح ہے اور ایک حدتک غلط۔ عوام کے سبھی خیالات ایسے ہی ہوتے ہیں، کچھ صحیح اور کچھ غلط۔

رام نگر ہائی اسکول کی لڑکیوں کا بھی اپنی معلمہ سونندا کے بارے میں یہی خیال تھا۔ سونندا بی۔ اے پاس تھی وہ پڑھانے کے علاوہ لڑکیوں سے بہت کم بات چیت کرتی تھی۔ دوسری معلمات فرصت کے وقت آپس میں بات چیت کرتی تھیں لیکن سونندا ان کی گفتگو میں بھی شریک نہیں ہوتی تھی چھٹی ہوتے ہی وہ اپنی کتاب وغیرہ اپنے چھوٹے سے بیگ میں رکھ کر چپ چاپ گھر چلی جاتی تھی۔ اُس کے اِس طریقہ سے سکول کی لڑکیاں اور معلمائیں اسکی عزت کرتی تھیں اور کچھ اس سے ڈرتی بھی تھیں۔

اس خیال کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ سونندا اپنے مکان میں تنہا رہتی تھی اس میں ایک بوڑھی ملازمہ کے سوا اور کوئی نہ آتا تھا اور وہ بھی رات کو اپنے گھر چلی جاتی تھی۔ ان باتوں سے لڑکیاں سمجھتی تھیں کہ سونندا ابھی بن بیاہی ہے لیکن اس کے برعکس سکول کی معلمائیں اسے مسز شرما کہہ کر پکارتی تھیں۔ اس سے لڑکیاں بہت حیران ہوتی تھیں ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ شاید سونندا بیوہ ہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ سونندا کی پیشانی پر ہمیشہ ایک چھوٹا سا سُرخ نشان ہوتا تھا، ہاتھوں میں چوڑیاں بھی ہوتی تھیں اور وہ اکثر ہلکے جوگیا رنگ کی ساری پہنتی تھی۔ یہ بیوہ کے انداز نہیں تو سکول کی لڑکیوں کے لئے سونندا ایک معما تھی۔ لیکن انہیں امید تھی کہ ایک نہ ایک روز یہ معما حل ہو کر رہے گا۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انہیں اس معمے کا حل معلوم ہوا یا نہیں، انہیں تو شاید اس کا بھی پتہ نہیں چلا کہ سونندا کے دل بھی تھا........

(۲)

"آج میں نہیں پڑھاؤں گی تم چھٹی مناؤ" سونندا کے یہ کہتے ہی لڑکیاں خوش ہو ہو کر جماعت سے بھاگنے لگیں تھوڑی دیر میں کمرہ بالکل خالی ہو گیا۔ سونندا نے ایک لمبی سانس لی اور آہستہ آہستہ گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

گھر پہنچ کر سونندا کوٹے میں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر لیٹ گئی۔ پھر اس نے پکارا۔ سکھیا!

سونندا کی ملازمہ نے اندر آکر کہا "آج جلدی چھٹی ہو گئی؟" پھر اس کا چہرہ اُداس دیکھ کر بولی۔ "طبیعت تو اچھی نا؟"

سونندا نے کہا ـــ "نہیں سکھیا آج پھر دل بہت دھڑک رہا ہے۔ جاؤ ڈاکٹرنی جی کو بلا لا"

سکھیا چلی گئی،

سونندا نے آنکھیں بند کرلیں۔ اسے تین چار سال پہلے کی بات یاد آگئی اُس روز جب اس نے کسی سے سنا کہ بی اے کے امتحان کا نتیجہ شائع ہو گیا ہے تو اس کا دل کیسا دھڑکنے لگا تھا۔ پھر جب اس کے بھائی نے آکر کہا کہ بہن مٹھائی کھلاؤ تمہاری انگریزی میں آنرس بھی آگیا ہے اس وقت جیسے اس کا دل اچھل کر منہ کو آگیا تھا......

اس کے بعد دوسری بار جب ایک روز اس کے ماں باپ اس کی شادی کی بات چیت کر رہے تھے اور سونندا آنگن میں کھڑی سن رہی تھی......

باپ نے کہا "لڑکا اچھا ہے زمیندار ہے سمجھدار بھی ہے ہاں پڑھا لکھا زیادہ نہیں ہے لیکن ساری باتیں کسی میں تھوڑی ہوتی ہیں"

ماں نے جواب دیا۔ "ہاں اُسے زیادہ پڑھنے لکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے پڑھے لکھے وہ جسے نوکری کرنی ہو میں تو کہتی ہوں سونندا کو بھی پڑھانا.....

اس وقت بھی کیسی دھڑکن ہو رہی تھی...... سونندا یہی سوچ کر وہاں سے بھاگ گئی تھی کہ کہیں ماں باپ اس کی حالت سے واقف نہ ہو جائیں...... اگلے سال اس کے باپ کا انتقال ہو گیا......اس وقت وہ کتنا روئی تھی۔

یکایک اُسے اپنی شادی کا وہ موقع یاد آگیا جب اس نے پہلے پہل گھونگٹ کی آڑ سے اپنے ہونے والے شوہر کی صورت دیکھی تھی۔ اس وقت اس کا دل کتنے تفکرات و تردات اور کتنی امیدوں سے لبریز ہو گیا تھا...... اس کی پُرسکون کچھ متین اور کچھ متفکر نگاہوں کو دیکھ کر وہ سوچنے لگی تھی کہ انہوں نے میٹرک کے بعد تعلیم کیوں ختم کردی!

تھوڑی دیر تک وہ چپ چاپ لیٹی رہی پھر ایک خط نکال کر پڑھنے لگی......

خط اس کے بھائی نند کشور کا تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ میں نے سُنا ہے نریندر بھائی کا ایک خط مکان پر آیا ہے وہ اس سال بی۔ اے کے امتحان میں آنرس کے ساتھ پاس ہو گئے ہیں.... میں نے ایک بات اور بھی سنی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میرے نزدیک وہ لوگ بہت ذلیل ہیں۔ نریندر کے ماں باپ ان کی دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔

لڑکی بھی پسند کرلی گئی ہے "

تمہیں رنجیدہ نہیں ہونا چاہئے۔ اچھا ہوا کہ تم وہاں سے چلی گئیں ورنہ تمہیں پہلے سے زیادہ تکلیف ہوتی۔

سوننداؔ نے خط کو بند کرکے جیب میں رکھ لیا اُسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے خط آیا ہے ۔ ۔ ۔ بی ۔ ۔ ۔ اے ۔ ۔ ۔ شادی کرنا چاہتے ہیں ۔ ۔ ۔ اچھا ہی کیا ۔ ۔ ۔ خیر ۔ ۔ ۔ باہر سیڑھیوں پر کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی ۔ سوننداؔ نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے ۔ ڈاکٹر مس پورنیا نے اندر آتے ہی پوچھا " کہیے مسز شرما آج پھر طبیعت خراب ہے، کیا ؟ "

سوننداؔ نے کہا " دل بہت دھڑک رہا ہے "

مسز پورنیا نے سٹیتھوسکوپ سے سینے کو دیکھ بھال کر کہا ۔ آج کوئی غیر معمولی واقعہ تو پیش نہیں آیا ! "

سوننداؔ تھوڑی دیر چپ رہ کر بولی " نہیں صرف گھر سے ایک خط آیا ہے "

مسز پورنیا کئی بار سوننداؔ کو دیکھنے آئی تھی اس لئے اس کی گذشتہ زندگی کا اُسے کچھ کچھ علم تھا شاید وہ سوننداؔ کی باتوں سے کچھ سمجھ گئی " اس نے کہا اچھا آپ خاموش لیٹی رہیں کسی بات کی فکر نہ کریں ۔ دل بہت کمزور ہو گیا ہے ۔ لیکن اگر میری ہدایات کا آپ خیال رکھیں گی تو کوئی اندیشہ نہیں ہے "

پھر سکھیا کو بلا کر کہا ۔ " دیکھو کوئی اِن کے پاس آنے نہ پائے اگر کوئی خاص بات ہو تو مجھے اطلاع دینا "

(۳)

سوننداؔ سوچنے لگی کہ ڈاکٹرنی کہہ گئی ہیں کہ میں کسی بات کا خیال نہ کروں ۔ کیونکر خیال نہ کروں ؟ خط کی باتیں پھر اس کے دماغ میں چکر لگانے لگیں "

سوننداؔ کو تین سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آگیا ۔ ایک روز اس کا شوہر باہر سے آیا اور اس نے ایک گلاس پانی مانگا شاید بہت پیاس لگی تھی ۔ اس وقت نوکرانی گلاس مانجھ رہی تھی ۔

سوننداؔ ایک کتاب لے کر پڑھنے بیٹھ گئی اسے بالکل خیال نہ رہا کہ اس کے شوہر نے پانی مانگا ہے ۔ جب اس کے شوہر نے اندر آکر پوچھا کہ کیا پڑھ رہی ہو تو سوننداؔ نے کہا " Dolls House " پھر اس کے چہرے کا انداز دیکھ کر بولی " شاید آپ ابسن کو نہیں جانتے "

اسی رات کو وہ کہیں چلا گیا ۔ جب دوسرے روز گھر نہ آیا تو اُس کی تلاش ہوئی ۔ سوننداؔ کو اپنے کمرے میں ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ " سوننداؔ میں جا رہا ہوں ابسن کو جان لوں گا تبھی تم سے ملوں گا "

لیکن ساس کے دریافت کرنے پر اس نے کچھ جواب نہیں دیا ۔ آخر کیا جواب دیتی کہ ابسن کو جاننے گئے ہیں ؟

اس کے بعد ساس رات دن طعنہ دینے لگی کہ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اس انگریزی پڑھی ہوئی چڑیل کو گھر میں نہ رکھو....... نہ جانے اس نے کیا کر دیا کہ وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گیا.....

آخر جب روز روز کا طعنہ برداشت نہ ہو سکا تو وہ یہاں چلی آئی اور نوکری کر لی۔ نند کشور پر زیادہ بوجھ ڈالنا مناسب نہ تھا۔ اور پھر ماں کیا کہتی؟ اگر باپ زندہ ہوتے تو شاید......

سونندا اس کے آگے نہ سوچ سکی اس نے سکھیا کو پکارا کہ پینے کا پانی دے جا۔

(۴)

ماں میں آگیا" یہ کہتے ہوئے نریندر گھر میں داخل ہوا۔

ماں نے خوش ہو کر کہا "بیٹا سلامت رہو تم نے تو ہمیں چھوڑ ہی دیا تھا۔ کتنے دبلے ہو گئے ہو"

نریندر ایک سوال کے لئے بیتاب تھا۔ لیکن یکایک اسے اس سوال کی ہمت نہ ہوئی کچھ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے پوچھا "ماں سونندا کہاں ہے؟"

ماں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ نریندر کو اس کے سکوت ہی سے جواب کا اندازہ ہو گیا۔ اس کے بعد ماں نے کہا۔ "اس چڑیل کا نام نہ لو' وہ نہ جانے کہاں چلی گئی"

نریندر کے دل میں خطرہ پیدا ہوا اس نے ڈرتے ڈرتے ماں سے پوچھا تم نے کچھ کہا تو نہیں؟"

"میں نے کیا کہا۔ یہی کہا کہ نہ جانے اس نے کیا کر دیا کہ لڑکا گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اتنے ہی پر اس نے کہا کہ ان کے بعد اس گھر میں میرا کوئی نہیں ہے۔ جب وہ ملیں گے جب ہی اس گھر میں آؤں گی۔ یہ کہکر اس نے ٹرنک اٹھایا اور نہ معلوم کہاں چل دی۔ بھلا بتاؤ"

نریندر نے اس کے آگے کچھ نہیں سنا چپ چاپ الٹے پاؤں باہر نکل گیا۔

(۵)

سونندا سوچ رہی تھی...... انہوں نے بی۔اے پاس کیا ہے۔ آنرس بھی کیا ہے..... اب دوسری شادی کریں گے..... شاید اس دفعہ پڑھی لکھی عورت نہ ہو گی".......

سونندا آنکھیں بند کئے پڑی تھی اب اس نے آنکھیں کھول دیں۔ نریندر کی دوسری شادی کا خواب اس سے نہیں دیکھا گیا۔

سکھیا پاس ہی سوئی ہوئی تھی سونندا نے اسے جگا کر پوچھا "سکھیا ابھی شام ہونے میں کتنی دیر ہے؟"

سکھیا اٹھ کر آنکھیں ملنے لگی۔ اس درمیان میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ سونندانے کہا دیکھ تو شاید ڈاکٹرنی جی آگئی ہیں۔ سکھیا نیچے گئی۔ سونندا لیٹی ہوئی سن رہی تھی کسی نے پوچھا "مسز سونندا شرما کا مکان یہی ہے؟"

آواز سن کر سونندا کانپ اٹھی ..... اس کا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سکھیا نے کہا ہاں کیا کام ہے؟

اُن سے جاکر کہو۔ ایک آدمی ملنے آیا ہے۔"

وہ بیمار ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کوئی ان کے پاس نہ جانے پائے"

اس کے بعد آنے والے نے جو کچھ کہا اس میں اتنی منت، اتنی بیقراری اور اتنی التجا تھی کہ سونندا پھر کانپ گئی۔

"جانتی ہو میں کون ہوں! سونندا کا شوہر ہوں، مجھے نہ روکو"

کوئی سیڑھیوں پر دوڑتا ہوا آیا۔ اور پھر نہایت پُر درد اور لرزتی ہوئی آواز سے ڈرتے ڈرتے پکارا۔ سونندا!

سونندا کا دل نہایت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کچھ بول نہ سکی، بستر ہی پر اٹھ کر بیٹھ گئی، اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے"

دل کی دھڑکن یکلخت بند ہوگئی۔ سونندا اُسی طرح ہاتھ بڑھائے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے گر گئی"

(۶)

"بڑھیا دوڑ کر کسی ڈاکٹر کو بلا لا"

بڑھیا دوڑی گئی اور مسز پورنیا کو بلا لائی"

مسز پورنیا نے آکر دل کی حالت دیکھی اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ اس نے نریندر سے پوچھا "تم کون ہو؟"

نریندر نے سر جھکا کر کہا "سونندا کا شوہر"

مسز پورنیا کچھ دیر خاموش رہی، جیسے جی کڑا کر رہی ہو، پھر بولی "دل کو یکایک صدمہ پہنچنے سے مسز شرما" ۔ پھر نریندر کا منہ دیکھ کر چپ رہ گئی۔ نہ جانے کتنی دیر تک سکوت رہا۔ نریندر پر جیسے سکتہ طاری تھا۔ اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ سونندا کو کیا ہوگیا! بہت دیر کے بعد نریندر سسک سسک کر کہنے لگا "سونندا تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں میں اس کو اچھی طرح جان گیا ہوں ....."

لیکن سونندا بہت دُور چلی گئی تھی اس لئے وہ کچھ نہ سن سکی۔

ابو محمد امام الدین

غزل

اب ہم کو خوفِ قیدِ زمان و مکاں کہاں
اب جس جہاں میں ہم ہیں وہاں یہ جہاں کہاں

اب قلب میں وہ برقِ محبت طپاں کہاں
اب جسم میں وہ روحِ رواں و دواں کہاں

اب جورِ گاہ گاہ کا احساں بھی کم نہیں
اب وہ توقعِ کرمِ بیکراں کہاں

جورِ فلک سے تو مفر آسان ہے، مگر
تیری نگاہِ لطف سے شکلِ اماں کہاں

وہ بدنصیب ہوں کہ تری آرزو مجھے
ناشادماں بھی رکھ نہ سکی شادماں کہاں

جس باغ میں تمہارے قدم سے بہار آئے
اُس باغ کی بہار کو خوفِ خزاں کہاں

وہ میکدے میں شیخ کی تشریف آوری
وہ میری التماس کہ حضرت یہاں کہاں

شیخِ حرم بھی مرجعِ اہلِ جہاں سہی
لیکن بسانِ حضرتِ پیرِ مغاں کہاں

ارمانِ التفاتِ دلِ دوستاں درست
شایانِ التفاتِ دلِ دوستاں کہاں

آزاد! اب قفس سے رہا بھی ہوئے تو کیا
گو آشیاں کی دھن ہے، پہ اب آشیاں کہاں

حکیم آزاد انصاری

فریزجن

فریزجن اور سترون کے گیت لکھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوا کہ اُس زمانے کے تھوڑے سے تاریخی حالات بیان کر دئے جائیں تاکہ گیت کی کچھ اہمیت بڑھ جائے۔ ولیم فریزر جس کو دلی والے فریزجن کہتے ہیں ۱۷۹۹ء میں کلکتے آکے اترا اور ۱۸۰۵ء میں اختر لونی کا معتمد مقرر ہوا ۱۸۱۱ء میں الفن کا معتمد ہو کر کابل گیا ۱۸۱۳ء میں سٹین کا نائب مقرر ہو کر پھر دلی آیا ۱۸۱۵ء میں مارٹن ڈیل کی فوج میں پولٹیکل ایجنٹ ہو کر ہمالیہ کا سفر کیا۔ ۱۸۱۹ء میں گڑھوال کی درنبدی کے جھگڑے کا تصفیہ کرنے پر تعینات ہوا ۱۸۲۶ء میں شمال مغربی سرحدی صوبے کی مال گذاری کا رکن ثانی بنایا گیا۔ ۱۸۳۰ء میں شاہ جہان آباد کا ناظم یا صاحب کلاں ہو کر آیا۔ اور اپنی وارفتہ مزاجی کی بدولت ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء میں کسی کے ہاتھوں ٹھکانے لگ کر زمین کا پیوند ہوا کشمیری دروازے جیمس سکنر کے گرجا میں مدفون ہے۔ شاہ عالم کی وفات کے کچھ عرصے بعد سے کمپنی کا یہ رویہ ہو گیا تھا کہ جس طرح بھی بنے دلی کے آس پاس کی کل جاگیروں کو ہضم کر جائے۔ میرے دادا حضرت ہز ہائی نس عالیجاہ پرنس آغا حسن جان نائٹ آف دی آرڈر آف پرشین لائن اینڈ سن۔ نائٹ آف دی آرڈر آف درانی ایمپائر (Knight of the Order of Persian Lion and Sun. Knight of the Order of Durrani Empire.

انگریز نوازی کی بدولت سارے شہر میں بدنام تھے۔ اور لوگ انہیں کرسٹان کہا کرتے تھے۔ ان کی سترہ حرمیں تھیں جن میں چار مختلف ممالک کی فرنگنیں بھی تھیں۔ اپنی دو بیٹیوں کو ۱۸۴۲ء میں انگلستان تعلیم کے لئے بھیج چکے تھے یہ دلی کے ان آدمیوں میں سے ہیں جنہوں نے سب سے اول انگریزی پڑھی اور انگریزی میں کتابیں لکھیں اور ۱۸۳۱ء سے روزنامچہ انگریزی میں لکھنا شروع کیا۔ اور ۱۸۵۷ء تک مسلسل لکھتے رہے یہ تمام قلمی مسوّدے سوائے تین چار جلدوں کے میرے قبضے میں تھے افسوس ہے کہ وہ ۱۹۲۲ء میں جب کہ میرا انہیں طبع کرانے کا ارادہ تھا چوری چلے گئے۔ اب اس کی بعض بعض جلدیں میرے خاندان کے مختلف افراد کے قبضے میں ہیں۔ اس روزنامچے سے اس زمانے کے فرنگیوں اور خاص کر انگریزوں کی ایشیائی پالیسی اور ان کی خفیہ ریشہ دوانیوں رشوت ستانیوں۔ جوڑ توڑ کرنے میں مال و دولت عزت ناموس کو قربان کر دینے کی کارگذاریوں پر حیرت انگیز روشنی پڑتی ہے۔ میرے دادا حضرت انگریزوں کے پولیٹکل

ایجنٹ بھی کچھ دنوں رہے ہیں۔ ان کے دادا کی ایک بہت بڑی جاگیر تھی جس کی آمدنی بیس لاکھ روپے سال تھی، اس میں فیروزپور جھرکہ۔ پلول اور ہوڈل وغیرہ علاقہ جات شامل تھے۔ لیکن مرہٹہ گردی میں یہ تمام جاگیر جو شاہان مغلیہ کا عطیہ تھی جاتی رہی۔ اور مرہٹوں نے اس کو دوسرے لوگوں کے حوالے کر کے چھوٹی چھوٹی مختلف زمینداریاں قائم کر دیں لارڈ ولیم بنٹنگ نے ایک رسالے میں اس جاگیر کا حال تحریر کیا ہے۔ جو کلکتہ میں چھپا تھا۔ اور بلیوبک لنڈن میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے۔ میرے دادا حضرت کے دادا نے چاہا کہ اس جاگیر کو پھر واپس لیا جائے۔ اس لئے انہوں نے کمپنی سے دوستی پیدا کی۔ کمپنی نے جاگیر کی واپسی کی امید دلائی لیکن شرط یہ قرار پائی کہ شاہ عالم مرہٹوں سے علیحدگی اختیار کریں اور کمپنی کی سرپرستی قبول فرمائیں۔ انگریزوں کا رسوخ دلی میں ہو جائے اور سب فرنگی کتوں سے کٹ جائیں۔ یہ اس زمانے میں شاہ عالم کے وزیر تھے اور حضرت عالم گیر ثانی کی بھانجی موتی بیگم ان سے منسوب تھیں۔ موتی بیگم کو شاہ عالم کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ اور شاہ عالم ان کے مشورے کو بہت سنتے تھے۔ آخر شاہ عالم کو مرہٹوں سے تڑا لائے جب لیک نے دلی فتح کی اور ایفائے وعدہ کا وقت آیا تو ان کو تو کچھ نہ ملا بلکہ اس جاگیر میں سے مختلف جاگیریں نئی بنا دی گئیں جن میں سے لوہارو۔ پاٹودی۔ دوجانہ۔ فرخ نگر۔ بلب گڑھ۔ داوری وغیرہ مشہور ہیں لیکن یہ نئی جاگیریں مصلحت وقت کے لحاظ سے بنائی گئی تھیں۔ کچھ عرصے بعد جب کمپنی کا طرز عمل بدلا تو یہ بے ضرورت معلوم ہونے لگیں۔ دوسرے دہلی کے نواح میں جو مسلمانوں کی سات سات آٹھ آٹھ سو برس کی پرانی جاگیریں تھیں اور جہاں مسلمان صدیوں سے قابض تھے ان کے زور کو توڑنا اور ان کا سر کچلنا بھی مقصود تھا۔ اس نواح کے ہندو جاگیردار بھی مغل پرستی اور مسلمان نوازی میں مسلمانوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔ بلکہ کچھ ان سے بھی زیادہ تھے۔ تاہم ایک امید کی جھلک ضرور ان کی بدولت نظر آتی تھی کہ موقع مناسب ملا تو بیچ میں ہڈی ڈال کر لشکار کے لڑا دئے جائیں۔ نفاق کے گوندے پر یہ ہندو مسلم گلام اچھی پالی کی بہار دکھا جائیں گے اس لئے ہندوؤں کو ہاتھ نہ لگایا گیا۔ ان کی بھیڑ کو وقت پر اٹھا رکھا کمپنی کا یہ وطیرہ ہو گیا کہ ہر حیلے بہانے چھوٹی موٹی زمینداریوں اور جاگیروں کو ضبط کرنے لگی اس سے ایک عام بد دلی اور اضطراب پیدا ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء میں شہر والوں کا انگریزی فوج کے ساتھ مل کر انگریزوں کو ہندوستان سے دفع کرنے کے لئے کھڑے ہو جانے کا ایک باعث یہ بھی تھا۔ ۱۸۲۳ء میں چھوٹی بڑی بہت سی جاگیریں ضبط ہوئیں ان میں سے منجھلی بیگم اور چھوٹی بیگم نواب ضیاء الدولہ کی سالیوں کی جاگیر مجاہد پور حوض خاص میر احمد علیخاں کی جاگیر۔ اوکھلہ وغیرہ نواب محمد علی خاں برادر نواب حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان استاد شاہ عالم و وزیر حضرت بہادر شاہ و دیگر مسلمانوں کی جاگیریں زبردستی بے سبب بے علت سے لی گئیں مرہٹہ گردی میں عارف جان کے بیٹے احمد بخش خاں نے اچھا نام پیدا کر لیا تھا۔ اور جب لیک کی مرہٹوں سے لڑائی ہوئی تو انہوں نے لیک کا ساتھ دیا۔

فتح کے بعد فیروز پور جھرکے کا بڑا علاقہ انکو دے دیا گیا۔ اور حضرت بادشاہ سلامت سے نوابی کا خطاب بھی مل گیا۔ ان کی دو بیویاں تھیں نکاحتا سے نواب شمس الدین تھے اور بیاہتا سے نواب امین الدین اور نواب ضیاء الدین تھے لیکن یہ دونو عمر میں تھے چھوٹے۔ اس لئے نواب احمد بخش خاں نے اپنی زندگی ہی میں ساری ریاست کا کار مختار اپنے بڑے بیٹے نواب شمس الدین خاں کو کر دیا۔ اور دونوں چھوٹے بھائیوں کی اچھی طرح غور پرداخت، تعلیم و تربیت کی ہدایت کر دی۔ جب تک نواب احمد بخش خان زندہ رہے۔ نواب شمس الدین ریاست کا کام سنبھالے رہے۔ اور اغیار کو کوئی موقع جوڑ توڑ کا نہ ملا۔ اِدھر تو اُن کی آنکھیں بند ہوئیں۔ اُدھر دراندازوں نے نت نئے شاخسانے نکالنے شروع کئے۔ اور اس کی کوشش کی کہ بھائیوں بھائیوں میں چلوا دیں کبھی چھوٹے بھائیوں کی نابالغی کو درمیان لا کے نواب کو دبایا جاتا۔ کبھی حصے بخرے ریاست کے کرائے جاتے۔ دلی کی نظامت سے کچھ فیصلہ ہوتا۔ کلکتے کی کونسل سے کچھ قرار پاتا۔ لندن کی چار چودھرس کچھ اور تصفیہ کرتی۔ غرض دلی کے صاحب کلاں کے گھرے تھے۔ لاکھوں ہی روپیہ اس ہیر پھیر میں وصول گیا۔ جو نیا صاحب کلاں ہو کے آیا۔ اُس نے نیا رنگ جمایا۔ اور خوب نقدیاں اُڑائیں۔ مقصود یہ تھا کہ کسی طرح سے اس ریاست کا تیا پانچہ ہو جائے۔ اس سے فراغت ہو تو دوسری ریاستوں پر مُنہ مارا جائے۔

آخر کمپنی نے سر تیج ہو کر لوہارو کے علاقے کو جو مہاراجہ الور نے نواب احمد بخش کو اُن کی خدمات کے جلو میں دیا تھا لینا چاہا۔ اور امین الدین خان اور ضیاء الدین خان کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے ڈلوائے۔ کہ کسی طرح بہ از خود علاقہ کمپنی کے سپرد کر دیں۔ لیکن اُنہوں نے اس کو منظور نہ کیا۔ اور لوہارو کا علاقہ نواب شمس الدین ہی کے قبضے میں رہا۔ وہ معقول گزارہ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو دیتے رہے۔ جواہرات اور کتب خانہ بھی اُنہی بھائیوں کے قبضے میں رہا۔ کتب خانہ آخر میں نواب ضیاء الدین نے ایک مطلب براری کے لئے ایلیٹ کی نذر کیا۔ اُس نے اِن کا کام نکالا اور تاریخ ہندوستان کی ترتیب میں اس کو اس کتب خانے سے بڑی مدد ملی۔ نواب شمس الدین نے دلی کے صاحب کلاں سے ہمیشہ میل جول رکھا۔ اُس کو بلانا یا زدید کے لئے اُس کی کوٹھی پر جانا۔ گھنٹوں کا بیٹھنا۔ دعوت جلسے سب ہی میں اس کو شریک کرنا۔ کبھی کسی قسم کی شکایت کی اس کو گنجائش نہ دی۔ اور فریزر سے تو خوب گہری دوستی اور بڑی پرانی تھی۔ فریزر جب دلی میں اوّل اوّل آیا ہے تو اس کا سن اٹھارہ بیس برس کا تھا۔ نواب کا بھی عنفوانِ شباب تھا۔ نواب احمد بخش خان زندہ تھے۔ نواب شمس الدین کو کسی قسم کی فکر نہ تھی نہ ذمہ داری۔

انگریز اہلکاروں سے ملنا جلنا۔ راگ رنگ میں شریک ہونا۔ اس زمانے کے نئے امیرزادوں کی وضعداری تھی۔ لیکن شہر کے قدیم امیر اُمرا اس کو بہت معیوب سمجھتے تھے۔ نواب اور فریزر بے تکلفی کی صحبتوں میں اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ جب فریزر دلی کا ناظم ہوکر آیا تو اس زمانے میں ریاست کی ساری ذمے داری نواب کے سر تھی۔ اور بُری بھلی چیزیں تمیز آسانی سے کرسکتے تھے۔ اُنہوں نے ان قدیم صحبتوں سے اجتناب کیا۔ فریزر کو یہ بے اعتنائی شاق گزرتی تھی۔ کوئی کھلم کھلا الزام لگانے کا موقع دستیاب نہ ہوتا تھا۔ خوئے بدرا بہانۂ بسیار۔ بی بکری ناؤ میں کیوں خاک اُڑاتی ہو۔ اس کو کوئی کیا کرے۔ نواب شمس الدین خاں جو پہلے ہزار اچھوں کے ایک اچھے تھے۔ اب لاکھ بُروں کے ایک بُرے ہوگئے۔ بات بات میں نکتہ چینیاں ہونے لگیں۔ بڑی بدانتظامی تو اُن کے ہاں یہ تھی۔ کہ بستی تو تھی میواتیوں کی پر نہ کبھی چوری ہوتی تھی اور نہ چکاری۔ نہ کسی کا خون ہوا نہ خرابا۔ نہ غریبوں کی بہو بیٹیاں زبردستی پکڑوا منگواتے تھے۔ کمپنی نے آخر کو کھوج نکالا۔ کہ یہ چوروں ڈاکوؤں سے ملے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کے علاقے میں تو چوری ڈکیتی ہوتی نہ تھی۔ اور لوگ خوش حال بحال تھے۔ البتہ کمپنی کے علاقے میں سنگین وارداتوں کی کمی نہ تھی۔ اور کیوں ہوتی۔ چوہی کُتیا جلیبیوں کی رکھوالی۔ ہاں نواب کے ہاں بھی یہی خرابیاں ہوتیں تو کوئی گِلہ نہ تھا۔ ایک حمام میں سب ننگے ہوتے۔ نکٹوں میں ناک والا نکو۔ کمپنی کے دل میں نواب کی گنجائش نہ رہی۔ اور ریاست کی بحالی کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ کہ جانے یہ بی گلہری کس دن رنگ لائیں۔ اس لئے اِس اُٹھتے پودے کو جڑ ہی سے چٹک لینا چاہیئے۔ فریزر اپنی شروع جوانی میں ایک جاٹنی کو جس کا نام سُرون تھا۔ زبردستی اُس کے گاؤں سے جاکر پکڑ لایا تھا۔ اس جاٹنی کی قلمی تصویر میرے ذخیرے میں ہے۔ فریزر کی قلمی تصویر خواجہ محمود صاحب کے پاس تھی جو اُنہوں نے لال قلعہ کے عجائب خانے کو دے دی۔ یہیں ایک تصویر نواب شمس الدین کے لڑکپن کی بھی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس میں اٹھارہ اُنیس کا سن معلوم ہوتا ہے۔ فریزر کی عمر اصلیت سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اور چہرے سے اُس کے آوارگی اور بدمعاشی پڑی برستی ہے۔ گالوں میں گڑھے پڑے۔ آنکھوں میں حلقے، ہونق چہرہ، ٹھوڑی پہ چھدری ڈاڑھی، دیدوں کے بُرے طور، جھب تختی بدطواری کے علامات نمایاں کرتی۔ غرض انجانا تصویر دیکھ کر فوراً کہدے کہ یہ کسی بڑے بدطینت، بدخصلت، آوارہ منش کی شبیہہ ہے۔ فریزر کو دیسی عورتیں بہت پسند تھیں۔ سُرون سے پہلے کسی لُہارنی کو گھر میں ڈال لیا تھا۔ اور اس کے بعد ایک سُنارنی کو پکڑ لایا۔ پرلے سرے کا ایک چھٹا ہوا تھا۔ میری دادی حضرت کے ہاں کی بڑی بوڑھی مغلانیاں مہری خانم، شمسی خانم، شرف النسا

وغیرہ کہا کرتی تھیں کہ نواب احمد بخش خان کی صاحبزادی حسن آرا بیگم یا حور لقا بیگم کے حسن کا شہرہ سن کر زنانے کپڑے پہن ڈومنیوں کے ساتھ حویلی میں گھس گیا۔ کسی کو کانوں کان نہ خبر ہوئی۔ صاحبزادی جب طشت چوکی پر گئیں۔ تو آنکھ بچا کر صحت خانے میں گھس گیا۔ وہ ایک اجنبی صورت دیکھ کر ڈر گئیں۔ چیخ جو ماری پہرے والیاں دوڑ کر اندر گئیں۔ دیکھا ایک لمبی تڑنگی عورت سراپچے کا باسن سر سے پیر تک چادر میں لپٹی کھڑی ہے۔ سب کی سب مل کر گھسیٹتی ہوئی باہر لائیں۔ خوجوں کو بلایا۔ دکھوایا تو موا مردوا نکلا۔ خوب جوتی کاری ہوئی۔ نواب احمد بخش خان مر چکے تھے۔ نواب شمس الدین خان اُن کے بڑے بیٹے گدی کے مالک تھے۔ اُن کا حسن غصہ اور طنطنہ شہر میں مشہور تھا۔ سب نے کہا بس تم بس تم، نواب کے کان میں اس کی بھنک نہ پڑنے پائے ورنہ خون خرابے ہو جائیں گے۔ نگوڑے کی چندیا تو پلپلی کر دی۔ موا غیرت دار ہوگا۔ تو چینی بھر پانی میں خود ہی ڈوب مریگا۔ باہر مردوں تک یہ بات کیوں جائے۔ غرض قصہ رفع دفع ہوا۔ نواب شمس الدین کی میں نے ایک اور تصویر دیکھی ہے۔ جو اُن کی پختہ عمری کی ہے۔ لٹ پٹی پگڑی بانکی ادا سے بندھی۔ انگرکھا پہنے۔ سیلا کمر سے بندھا۔ خنجر اس میں اڑسا، ڈاڑھی چڑھی صورت سے بہادری و مردانگی ہویدا، اچھے کلے ٹھلے کا دیدار و جوان۔ اس تصویر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ شخص اب تائب ہے۔ اور لڑکپن کی کمزوریوں کو دور کر چکا ہے۔ فریزر سے آخر کے دنوں میں بس دور ہی کی صاحب سلامت رہ گئی تھی۔ نواب جلسوں سے بھاگتا تھا۔ اور عیاشیوں سے کانوں پر ہاتھ دھرتا تھا۔ فریزر کو یہ باتیں ناگوار گزرتی تھیں۔ اور اکثر وہ اس کا گلہ اپنے دوستوں سے برملا کیا کرتا۔ میرے دادا حضرت سے بھی اس کی بہت دوستی تھی۔ اور اُس کے بہت سے خطوط میرے والد صاحب قبلہ کے قبضے میں تھے۔ ہاتھوں مہندی پیروں مہندی اپنے بھین اور وں دینیدی۔ جو نقائص اپنے ہیں تھے۔ وہی اس کو نواب میں نظر آتے تھے۔ بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ، فریزر سے سینکڑوں لوگ نالاں تھے۔ جن کی بہو بیٹیاں اُڑائیں تھیں وہ تو اس کے خون کے پیاسے تھے۔ اور آئے دن کے جو تئے جھگڑے اِدھر اُدھر رنڈیوں کسبیوں کے کوٹھوں اور اڈوں پر سے خرید لاتا تھا وہ الگ رہے۔ شہر کے بیسیوں اوباشوں، رنڈی بازوں، بدمعاشوں سے اُس کی لاگ ڈانٹ تھی۔ شریف اور اُمرا ملنے میں عار سمجھتے۔ مگر مطلب سے مجبور اور غرض سے لاچار تھے۔ بن ملے نہ بنتی تھی۔ فریزر رات بے رات وقت بے وقت اڈوں، کوٹھوں، نٹنیوں، کنجریوں، خانگیوں میں خراب خستہ پڑا پھرا کرتا تھا۔ آخر اسی شہدپن اور آوارہ گردی میں جان گنوائی۔ راجہ کشن گڈھ کے ہاں ناچ گانے کا جلسہ تھا۔ خوب پی اور بدمست ہوا۔ آدھی

مات کو گھر کی سُوجھی۔ لوٹنیوں میں سے کسی نے بھر دو گاڑا جھونک دیا۔ یہ تو اپنی جان سے گیا۔ اور اپنے کئے کی سزا پائی۔ کمپنی کے دونوں میٹھے ہوئے۔ چٹ بھی میری پٹ بھی میری انٹا با وا دادا کا۔ طرح طرح کے شُبہ ہونے لگے۔ کبھی ظلِّ سبحانی حضور اکبر ثانی کی طرف خیال کی جسارت کی۔ کبھی جھجّر کے مرزبان نواب فیض طلب خان کو پھانسنے کی سوجھی۔ آخر میں نواب شمس الدین خان ترتراتا نوالہ نظر آئے۔ بس اب کیا تھا۔ اُن کے ہاں کچھ خاندانی پیچیدگیاں اور نزاعات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ یہ آسانی سے پھنس سکتے تھے۔ نواب کی بدقسمتی کہ کریم خان ان دنوں کتے لینے شہر میں آیا ہوا تھا۔ ریاست کے اکثر آدمی ہمیشہ آتے جاتے ہی رہتے تھے۔ بلکہ اُن سب کے تقریباً مکان شہر اور ریاست دونوں جگہ تھے۔ کبھی یہاں رہتے کبھی باہر ریاست میں۔ کمپنی کے تو ریاست پر دانت تھے۔ کریم خان کے قیام کو دوسری نظر سے دیکھا۔ یہ نواب احمد بخش خان کے زمانے کا تھا۔ اور نشانے میں اپنا ہمسر نہ رکھتا تھا۔ کہتے ہیں اندھیرے میں آواز پر گولی چلاتا تو دانت توڑ گدی کے پار ہو جاتی۔ اس لئے اس کو بھر مارو کہتے تھے۔ یہ نواب کا مصاحب بھی تھا۔ اس کا ایک خط پکڑا گیا۔ جس میں مذکور تھا۔ کہ اس کتے کے کئی گاہک ہیں۔ اگر سب کے مقابلے میں خریدا تو دام بہت بڑھ جائیں گے۔ نواب نے جواب دیا کہ ایسی کیا جلدی ہے۔ خریدار چھٹیں گے تو دام گر جائیں گے۔ تب لے آنا۔ لیکن لے کر آنا ضرور۔ اس پر یہ حاشیہ چڑھایا گیا اور یہ مضمون تراشا گیا کہ کتے کا مطلب کا فرفرنگی ہے۔ اس سے مراد فریزر ہے۔ اور یہ اشارہ تھا۔ کہ اس کے ساتھ آدمی بہت رہتے ہیں۔ مارنے میں وقت ہوگی۔ جب چھیڑ ہو اور اکاؤ کا نوکر اس کے ساتھ ہو تو مار لینا۔ بس اب کیا تھا۔ مدعا ہاتھ آگیا۔ نواب نے کچھ شورہ پُشت لے لوٹ نادہند میواتی اپنے علاقے سے نکال دیئے تھے۔ یا وہ میواتی جن کے ذمے ریاست کا لگان تھا۔ وہ چوری چھپے ریاست سے نکل بھاگے تھے۔ اور کمپنی کی سرحد میں جہاں جہاں میواتیوں کی بستیاں تھیں چھپتے پھرتے تھے۔ ان میں سے دو چار کو سکھا پڑھا کر ہموار کر لینا کیا دشوار تھا۔ جو اس ڈھب کے ملے اُن کو نواب کے خلاف لا کھڑا کیا۔ اور فریزر کا خون نواب کے سر تھوپ دیا۔ نواب کی طلبی ہوئی۔ ان کارروائیوں کی خبر نواب کو بھی ہوئی۔ آنے سے انکار کیا۔ سارے میواتی لٹھ لے کر کھڑے ہو گئے۔ جو لینے گئے تھے۔ اپنا سا منہ لے خالی ہاتھ آئے۔ آخر بڑی قسما قسمیوں اور حلف درمیان میں لانے کے بعد نواب دلّی آئے۔ اس کفر کچہری میں غریب کا فیصلہ ہوا۔ پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ سنتے ہیں کان گنہگار ہیں۔ کہ غالب کو بھی ان سے علی کا فرکا سا بَیر تھا۔ اُنہوں نے بھی اُن کے خلاف گواہی دی تھی۔ دروغ برگردنِ راوی۔ نواب کے خسر نے بھی پھنسوانے میں مدد دی۔ اور

وہی ریاست سے جا کر اُن کو شہر میں لائے۔ لیکن یہ روایت نواب امین الدین خان والوں اور ضیاء الدین خان والوں کی زبانی ہے۔ واللہ اعلم۔ ہندوستان کے سب سے پہلے مسلمان نواب شمس الدین خان ہیں جن کو پھانسی دی گئی۔ حکم کو اُنہوں نے بڑے استقلال سے سنا اور کہا کہ خدا عالم ہے۔ کہ میں بے گناہ ہوں اور مجھ پر بے جا ظلم ہو رہا ہے۔ چونکہ میں مظلوم ہوں اس لئے معصوم اور شہید ہوں۔ شہید مرتے نہیں۔ بلکہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ اس کے بعد کچہری سے باہر آئے اور جو معمول تھے اُن میں سرِ مُو فرق نہ آیا۔ اشتہامیں رزمہ برابر کمی نہ ہوئی۔ اچھی طرح اپنے اطمینان سے کھانا کھایا۔ رات ہوئی تو سوئے بھی ایسی بے خبری سے کہ جیسے صبح کچھ ہونے والا ہی نہیں۔ لوگوں نے خراٹوں کی آواز سُنی۔ صبح غسل سے فارغ ہو۔ وضو کر سبز پوشاک شہیدوں کا بانا پہن مقتل کی طرف روانہ ہونا چاہا۔ لیکن ظالم مُوذیوں نے کپڑے جسم سے اُتار لئے۔ اور ٹاٹ کی کُرتی ٹاٹ کا جانگیہ ٹاٹ کی چرنا ٹوپی پہنا کشاں کشاں لے گئے۔ ڈھنڈورچی نے پہلے سے ڈھنڈورا پھیر دیا تھا۔ کہ خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا، حکم کمپنی بہادر کا۔ جو کوئی عورت مرد، بوڑھا بالا مقتل کے قریب آئے گا۔ اور شہر سے باہر نکلے گا مار دیا جائے گا۔ کشمیری دروازے کے باہر انگریزی فوج پھیلادی گئی۔ اور پیش بینی کے خیال سے آس پاس کی چھاؤنیوں سے مزید دستے طلب کر کے تعیّنات کر دیئے۔ تمام رستے روک دیئے گئے۔ بھنگی جو پھانسی کی رسی ڈالتا ہے۔ اُس نے جب نواب کو دیکھا رونے لگا۔ اور اپنی بے بسی پر ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ نواب بڑی متانت اور وقار سے آگے بڑھے۔ ذرہ برابر گھبراہٹ یا اضطراب کسی حرکت سے ظاہر نہ ہوتا تھا۔ جب پھانسی دے دی گئی۔ تو رسی ہی پر خود بخود نواب کی لاش قبلہ رُخ ہو گئی۔ جب نواب کی رُوح جنت کو سدھاری۔ تو کمپنی نے خوشی میں باڑیں سر کیں۔ شہری باہر نکلے۔ لاش ٹھنڈی ہوئی تو اُتاری۔ سب نے دیکھا کہ منہ قبلہ کی طرف تھا۔ جو بہشتی اور مظلوم ہونے کی امٹ نشانی تھی۔ شہادت کی تمام علامات عیاں تھیں۔ بعد ازاں شہر والوں نے تجہیز و تکفین کی۔ اور قطب صاحب میں دفن کر آئے۔ مدتوں لوگ زیارت کے لئے نواب کی قبر پر جاتے رہے۔ اور گھر گھر اس شہیدِ مظلوم کا رونا رہا۔ بادشاہ سلامت کو بھی بہت ملال ہوا۔ کچھ عرصے بعد نواب شمس الدین کی بیوہ مع نواب کے صاحبزادے نواب مرزا لال قلعے میں چلی آئیں۔ اور اُن کا مرشد زادہ آفاق مرزا فخرو ولی عہد سے عقدِ ثانی ہو گیا۔ گھر گھر اس شہیدِ مظلوم کا رونا رہا۔ شہر کے وہ قدیم اُمرا کے گھرانے جو عارت جانیوں کو نودولیتا سمجھتے تھے۔ اُن کے شریکِ غم ہوئے۔ اور جنہوں نے نواب پر تو تیئے جوڑے تھے اُن پر نفرین کرتے تھے۔ نواب شمس الدین خان کی ریاست ضبطی میں آئی۔ میرے دادا حضرت نے اپنی کارگذاریاں۔ اور کمپنی بہادر پر اپنی

جان نثاریاں گنوائیں - اور فیروز پور جھرکے پر اپنا قدیمی استحقاق جتایا - بہت دوڑ دھوپ کی - اس کی پوری کارروائی بلو بک لندن میں موجود ہے - یہ زمانہ جاگیر واپس دینے کا نہ تھا - بلکہ جاگیریں اور ریاستیں ہڑپ کرنے کا تھا - میرے دادا حضرت کو اُن کی تاحینِ حیات چوبیس ہزار سال گذارے کے ملتے رہے - اُن کے انتقال کے بعد اُن کی چار بیویوں اور چند حرموں کو معقول گذارہ ملتا رہا - اور تینوں لڑکوں کو سو سو روپے ماہوار جیب خرچ کے ملتے رہے - میرے باوا جان قبلہ کو سرکارِ انگریزی سے چھتیس ہزار روپے ملتے رہے - لیکن کمشنر سے ناموافقت کی وجہ سے گذارہ موقوف ہوگیا - فیروز پور جھرکہ کے دعوے کا اکثر رہ رہ کے ہمارے خاندان میں اشغلہ اُٹھا کیا - لیکن گوہرِ مقصود کبھی حاصل نہ ہوا - فریزر کی قبر کشمیری دروازے میں جیمس اسکنر کے گرجا میں اب تک موجود ہے - دلی کے آس پاس اب بھی جاٹوں کے گاؤں میں فریجن کی یاد تازہ ہے - دلی پیاری کے بسنے والے خوش نصیبوں میں کونسا ایسا ہوگا - جس نے گلابی جاڑے کی چاندنی راتوں میں قطب صاحب کے قیام یا آس پاس کے جنگلوں کی سیل میں ڈھولک اور سارنگی کے ساتھ لمبی اوپر جانے والی آواز میں کھڑاگ کی کھٹ کھٹ سے ملے ہوئے سُروں میں فریجن اور سرون کا گیت نہ سنا ہوگا - یہ گیت سو برس سے زیادہ کا ہے - میرے چھٹپن میں بھی شہر میں برسات کی راتوں میں پرانی مامائیں، اصیلیں، مغلانیاں تھوڑے سے الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ گایا کرتی تھیں - اور برسات کے گیتوں میں بیسیوں گیت تھے۔ "چتر بنجارے"۔ "نیلی سی گھوڑی بانکی"۔ "جارے مغل کے چھوکرے جھجری پانی کی لا پیاسی مرے چندا راولی"۔ "جھولا کن ڈالو رے امریاں"۔ "مہاراجہ کیوڑیاں کھولو رس کی بوندیں پڑیں"۔ "جمنا پہ چھائی رے کالی گھٹا"۔ "آئی اندھیری رات رے میں بھیجی جاؤں"۔ "ماں آڑو جامن گھٹے دھرے"۔ "نیم کی نبولی پکی ساون کا دن آئیگا"۔ "کوئی بندا چانول لا بورے دال ہے مسور کی"۔ "بیر ساون آیا رے اب مورے سیاں گئے ہیں بدیس موہے چندری کون رنگا دے"۔ "اماں میرے باوا کو بھیجوری کہ بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری"۔ "جوڑا تو ہاتھی دانت کا رے"۔ کس کس گیت کی یاد کرکے چھاتی پیٹوں - سینکڑوں ہی گیت تھے - کہ جہاں جھولے میں ٹنگے اور ہیں کہ نکلتے چلے آتے ہیں - ختم ہی ہونے پر نہیں آتے - سقنیاں ہیں کہ الگ ڈھولکی اور سارنگی کے ساتھ اپنے الاپ رہی ہیں - دھوبیوں کے کھنڈ الگ ہیں - جانے دلی پیاری میں دلی والے رہے بھی یا نہیں - یا ہیں تو وہی سیلانی جیوڑے ہیں - جو میرے چھٹپنے میں تھے - باہر والوں اور نئے تماشیوں کے لئے یہ گیت جو میرا ذہن محفوظ رکھ سکا - لکھتا ہوں - اس سے فریجن کے کچھ کارنامے معلوم ہونگے - اس زمانے کے شہر والوں کا تو کیا ذکر ہے - باہر کے آئے حیوان بھی یہاں انسان بن جاتے تھے - یہاں کی زبان ادب آداب تمیز قاعدے سیکھ آدمیوں میں شمار ہونے لگتے - خیر شہر کی تو بات ہی اور

ہے - آس پاس کے گنوار بھی اپنی تک بندی میں مطالب کو ایسا ذہن نشین کر دیتے کہ اور جگہ باید و شاید - بات بات پر گیت بن جاتے - فریجن سَرون کے گیت کی خاص دُھن ہے - جو سننے ہی سے تعلق رکھتی ہے - ہائے اب تو شاید اس کا گانے والا بھی کوئی نہ رہا ہوگا - وہ رہی سہی سبھا بھی اُلٹ گئی - شہری شہر بدر ہوئے - باہر والے آن گھسے - نہ وہ شہر رہا نہ وہ لوگ رہے - جب ہم ہی وہاں نہ رہے تو رہتا کیا خاک - اب تو یہ بھی کوئی نہیں بتا سکتا گانوں "گنگانا" ہے - گوہانہ ہے یا "ننگانا" ہے - اور بہت سے سائیں کے لال ایسے بھی ہوں گے - جنہیں یہ بھی نہ معلوم ہو کہ دھولا کنواں کہاں ہے - جانے کس کھن پیرے سبز قدموں کی بدولت یہ سارسنی آئی - ہائے دلّی وائے دلّی +

یہ واقعات میں نے سکندر جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ سے جو نواب شمس الدین کی بہن کی نواسی تھیں سُنے ہیں - اُن کو میں دادی اماں کہا کرتا تھا - اور اُن سے بہت مانوس تھا - مرحومہ بھی مجھ سے بہت اُلفت رکھتی تھیں اُنکی صاحبزادی اختری بیگم صاحبہ مرحومہ سرامیر الدین خان بہادر نواب لوہارو سے منسوب تھیں - بسم اللہ بیوی صاحبہ بنت نواب شیر جنگ بہادر جو میرے نانا نواب احمد حسن خان صاحب مرحوم سے منسوب تھیں - وہ بھی فریجن اور مرزا شمس الدین کے واقعات سنایا کرتی تھیں - اور اکثر شہر کی بڑی بوڑھیوں اور پُرانے ثقہ و سنجیدہ لوگوں سے میں نے تمام مذکورہ بالا حالات سُنے ہیں - گیت ملاحظہ ہو :-

"دُھر کلکتے سے چلا فریجن پانچوں پیر منائے - اللہ جانے رے پانچوں پیر منائے - پانچ مقام دلّی کے نولے چھٹا گوہانہ گاؤں - اللہ جانے رے چھٹا گوہانہ گاؤں - دَھولے کنوئیں پہ تنبورے تانے میخیں دیں گڑوائے - اللہ جانے رے میخیں دیں گڑوائے - پانچ سوار چھٹا رے فریجن سَرون ڈھونڈن جائے - اللہ جانے رے سَرون ڈھونڈن جائے - جکوئی سَرون کا بھید بتائے ہاتھی دُونگا انعام - اللہ جانے رے ہاتھی دُونگا انعام - سگے چچا نے بھید بتایو سَرون باجرے میں - اللہ جانے رے سَرون باجرے میں - ڈولے ڈولے چلا فریجن پانچ سوار لئے - تیرا مریو پانچ سوار لئے - پانچ پیڑ باجرے کے کاٹے چھٹا نہ کاٹا جائے - اللہ جانے رے چھٹا نہ کاٹا جائے - ہاتھ میں گوپیا ڈونگے درانتی ٹوٹے بکاتی جائے - اللہ جانے رے ٹوٹے بکاتی جائے - ہاتھ پکڑ ہاتھی پہ ڈالا سَرون روتی جائے - تیرا مریو سَرون روتی جائے - امی چندر روتا ڈولے سَرون میری جائے - تیرا مریو سَرون میری جائے - بھائی بھتیجو سبھی جو کنبہ مل لے سَرون پھیر ملن کی نائے - اللہ جانے رے سَرون پھیر ملن کی نائے - اُلٹے سلٹے گوندھ دے ری نائی کی پھر نہ گندھاون آئے - اللہ جانے رے پھر نہ گندھاون آئے -

آگے لہار کی پیچھے سنار کی بیچ میں سُندرون جائے۔ اللہ جانے رے بیچ میں سُندرون جائے۔ آدھی رات پہر کا تڑکا تارے گنتی جائے۔ اللہ جانے رے تارے گنتی جائے۔ چھوٹے بگڑ سے بڑے بگڑ میں جائے۔ اللہ جانے رے بڑے بگڑ میں جائے۔ پیڑھی کا بیٹھنا چھوڑ میری سُندرون کرسی کا بیٹھنا سیکھ۔ اللہ جانے رے کرسی کا بیٹھنا سیکھ۔ ہاتھوں سے کھانا چھوڑ میری سُندرون چھری کانٹوں سے کھانا سیکھ۔ اللہ جانے رے چھری کانٹوں سے کھانا سیکھ۔ لہنگے کا پہننا چھوڑ میری سُندرون ساڑے کا پہننا سیکھ۔ اللہ جانے رے ساڑے کا پہننا سیکھ......" +

آغا حیدر حسن دہلوی

ہمالہ کی بلندیوں کے سامنے

ہیچ ہے اِس کوہ کے آگے کلیساؤں کی شان
ہے فضائے شہر تک محدود گرجاؤں کی شان

ٹُوٹ جاتا ہے یہاں پر خانقاہوں کا غرُور
کیقبادوں کا تکبّر، کجکلاہوں کا غرُور

دیو پیکر پتھروں کی شان و شوکت دیکھکر
دیکھ کر اُن کی بلندی اُن کی رفعت دیکھکر

اپنی کمزوری کا چلتا ہے پتا انسان کو
یاد آتا ہے پہاڑوں میں خُدا انسان کو

آہ دی ہوتی اجازت گر مجھے اسلام نے
مَیں جُھکا دیتا سر اپنا پتھروں کے سامنے

فاخر ہریانوی

کسی کے نام

یہ اُلفت کی باتیں، محبت کی گھاتیں، جوانی کی راتیں، نہ پھر پاؤ گے
مرے ساتھ اگر دادِ عشرت نہ دو گے، یہ دن یاد کر کر کے پچھتاؤ گے

حسینوں کی سُن کر وفاداریاں ہو گے بیحد خجل، دل میں شرماؤ گے
تم اپنا شباب اور میری محبت، بہت یاد کر کر کے پچھتاؤ گے

مرا تذکرہ بھی سنو گے کسی سے، تو آنکھوں میں تم اشک بھر لاؤ گے
مرا نام لے لے کے کوسو گے خود کو، مجھے یاد کر کر کے پچھتاؤ گے

یہ حُسن و جوانی نہ قائم رہے گی، کبھی آئینہ دیکھ اگر پاؤ گے
تو حُسن و جوانی پہ چاہت سے نفرت، بہت یاد کر کر کے پچھتاؤ گے

جوانی کا مینائے سربند خود جوشِ مستی سے، اک روز کھل جائے گا
مئے حُسن مل جائے گی خاک میں، پینے والا میسّر نہیں آئے گا

جوانی کا تم لاکھ ماتم کرو گے، مگر صبر پھر بھی نہیں آئے گا
محبت کو ہر چند ڈھونڈو گے، اہلِ محبت نہ تم کو کوئی پائے گا

وفادار تم کاش ہوتے، یہ حسرت سدا کے لئے دل میں رہ جائے گی
تمنّا، کہ ہوتی تمہیں مجھ سے اُلفت، سدا کے لئے دل میں رہ جائے گی

محمد یوسف جمال

معیارِ حُسن اور حُسنِ عرب

یہ بات مشہور ہے۔ کہ حُسن وجمال کے متعلق ہر شخص کا ذوق جدا اور ہر گروہ کا معیار الگ ہے۔ لیکن صفاتِ حُسن کے متعلق جتنی باتیں بھی بیان کی جاتی ہیں، اور اختلافِ اذواق کے لحاظ سے جتنے معیار بھی قائم کئے جاتے ہیں۔ عرب میں اُن سب کی جامع ایک ایسی جہت موجود ہے، جس پر تمام مقیاس ومعیار متفق ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس میں تو اختلاف ہی نہیں۔ کہ حُسن چمڑے کے کسی قسم کے رنگ کا نام نہیں بلکہ حُسن نام ہے قد وقامت کے اعتدال، کھوپڑی کے استوا، چہرے اور دیگر اعضاء کے اجزا کی مناسبت کا، منہ کے شیریں ہونے اور آنکھوں کے ملیح ہونے کا، ابرو کی لطافت اور ہونٹوں کے پتلے ہونے کا، یہ جملہ صفات عرب میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور جب اِن صفات کے ساتھ سرخی اور سبزی مائل چمڑے کی سفیدی بھی ہو تو حسن اپنے انتہائی کمال پر ہوگا۔

چونکہ حُسن عرب میں اِن جامع صفات کے ساتھ کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اس لئے شعراءِ عرب نے اپنے کلام میں اِس حسن کو کثرت سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ اُن کا ایک شاعر "ذوالرمہ" کہتا ہے:۔

بَیضَاءُ صَفرَاءُ قَد تَنَازَعَهَا لَونَانِ مِن فِضَّةٍ وَمِن ذَهَبِ۔	سفیدی اور زردی جو سونے چاندی کے دو رنگ ہیں اُن کی آپس میں مڈبھیڑ ہوگئی ہے۔

سفیدی اور زردی کا ملا جلا رنگ موتی (لولؤ) میں پایا جاتا ہے۔ اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سفیدی میں زردی جھلملا رہی ہے۔ اِسی وجہ سے قرآن پاک میں حسینانِ جنت کو "لؤلؤ مکنون" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ یہ رنگ حسن کی انتہا لئے ہوئے ہے۔ چنانچہ آج تک جو شخص بھی اس رنگ کا حامل ہوا اور ساتھ ہی اُس کے اعضاء میں تناسب بھی ہوا تو اُس کے کامل طور پر حسین وجمیل ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہوا۔ اگر زردی مائل سفیدی میں سرخی بھی جھلملا رہی ہو۔ تو وہ حسن میں اور زیادہ لطافت پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ عرب کے ایک شاعر "عدی بن زید" نے اسے اس طرح بیان کیا ہے:۔

حمرة خالط صفرة فی بیاض مثل ما	زردی مائل سفیدی میں سرخی ایسی معلوم ہوتی ہے۔

حائك حائك دیباجا - گویا بننے والے نے دیباج بُن رکھا ہے +

اور چونکہ عرب میں بیاضِ لطیف بکثرت پایا جاتا ہے - اس لئے اُنہوں نے اِس کو صبح سے تشبیہ دی۔ اور صبح سے ایک رنگ کا اشتقاق کر کے ابیض کو صبیح کہدیا - اسی طرح سُرخی مائل سفیدی کو زہر سے تشبیہ دی - اور اُسی سے ازہر مشتق ہوُا - گلابی رخساروں کی تشبیہ عرب میں بکثرت پائی جاتی ہے - اگر یہ رنگ عرب میں کثرت سے نہ پایا جاتا تو یہ تشبیہات کہاں سے آتیں اور کس کے لئے دی جاتیں +

اسی طرح عرب حسینوں کی سفید اور بلوری گردن کو (اباریق الفضۃ) چاندی کی صراحیوں سے تشبیہ دیتے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں صراحی دار بلوری گردنیں بھی کثرت سے ہوتی ہیں +

یہ غضب کا حسن وجمال ہی تو ہے جس کی وجہ سے عرب انتہائی دل پھینک واقع ہوئے ہیں - منجملہ دیگر خصوصیات کے عرب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُن کے دل تجلیاتِ حسن کی جولانگاہوں میں دیوانہ وار رہتے ہیں - اور اُن کے چہرے انوارِ حسن کی روشنیوں ہی کی جانب مائل رہتے ہیں +

حسن کی دلفریبیوں اور جمال کی دلچسپیوں نے اُن کے ذوق کو اتنا لطیف بنا دیا ہے کہ ہر اچھی صورت پر ریجھ جانے کے وہ عادی ہو گئے ہیں - حسن کی شوخیوں نے اُن کو اس بات کا بھی خوگر بنا دیا ہے کہ وہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں - اِن حالات نے اُن کو یہاں تک جِلا دی کہ ہر دعوتِ حسن پر لبیک کہنے کے لئے اُن کو تیار کر لیا - حتیٰ کہ اُس لطیف ترین دعوت کو قبول کرنے کے لئے بھی اُن کو تیار کر دیا جو اُن کو دُنیا کے اس کمترین حسن سے بہترین حسن کی طرف لے جائے - ادنیٰ سے اعلیٰ کی جانب پہنچا دے اور حسنِ فانی کے زوال پذیر عشق کی ناکامیوں سے نکال کر حسنِ باقی کے ازلی و ابدی جمال کی لازوال محبت سے مالا مال کر دے - اور اُن کو اُس جمال کے تصور کی طرف منتقل کر دے جو ہر حسن اور ہر جمال کا مصدر ہے - نیز اُن کو اُس کمالِ معنوی کا عشق عطا فرمائے جو دُنیا بھر کے کمالات سے بالاتر ہے -

جو لوگ جمالِ محسوس کے ساتھ والہانہ شغف رکھتے ہیں اُن کو جمالِ معقول کا سمجھ لینا کچھ دشوار نہیں - اور اس دیکھی بھالی دُنیا سے اُس اَن دیکھے عالم کی طرف منتقل ہو جانا کوئی مشکل نہیں، جہاں یہاں کی نسبت بہت زیادہ حسن و جمال دیکھنے میں آئے +

(ترجمہ از عربی)

فیض محمد کوکب جوالاپوری

~~~~~~~~~
~~~~~~~~~

خواجہ کی البیلی زبان

حضرت خواجہ حسن نظامی کے اسلوبِ بیان پر ابھی تک کوئی دلچسپ تنقید نظر نہیں آئی۔ آئیے آج "دلی والے رسیا" کے اندازِ بیان پر کچھ خیال آرائی کریں۔ ہم نے خواجہ صاحب مدظلہ کو "دلی والا رسیا" کیوں کہا؟ صرف اس وجہ سے کہ یہ نام اُن کے اندازِ کلام کی صدائے بازگشت ہے۔ اُن کی ادبی نغمہ آفرینیوں کا گراموفون اور تقریری بے تکلفیوں کا ریکارڈ ہے۔ پہلے اِس نام کی تشریح ملاحظہ ہو۔

دِلی۔ جس نے دل لے لیا ہو۔ اُن کی زبان واقعی ہر شخص کے دل کو موہ لیتی ہے۔

"دِلی والے" اور "کملی والے" وغیرہ الفاظ سے ایک قسم کی عام سادگی اور ایک قسم کا دیسی پیار ظاہر ہوتا ہے۔ اور "دیسی پیار" ہی خواجہ صاحب کے لٹریچر کا شعار ہے۔

"رسیا" یعنی نہایت دلچسپ، رسیلا، نشیلا، متوالا اور البیلا۔ خواجہ صاحب کے کلام کو پڑھیئے تو معلوم ہوگا کہ کوئی بھولا بھالا، علم و ہُنر کی دُنیا کا اُجالا، شرابِ محبت کا متوالا، نہایت البیلے پن سے مسکرا مسکرا کے محبت کی کہانی اپنے معصوم دل کی زبانی سُنا رہا ہے۔

حضرت خواجہ صاحب کے اسلوبِ بیان پر ملک کے بڑے بڑے نقادوں نے مختلف طریقوں سے خیال آرائی کی ہے۔ جناب حامد اللہ صاحب افسر لکھتے ہیں کہ آج کل اگر کسی ادیب کو اسٹائلسٹ (صاحبِ طرز) کہا جاسکتا ہے تو وہ صرف حضرت خواجہ حسن نظامی ہیں۔ وہ اسٹائل کیا ہے؟ کوئی کہتا ہے کہ سادگی اور عام الفاظ کی کثرت ہے، کوئی لکھتا ہے کہ "رجائیت اور مقبولیت" ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ "بانکپن" ہے۔ کوئی لکھتا ہے کہ آزادی اور بے تکلفی ہے، کوئی کہتا ہے کہ یہ سب ٹھیک نہیں بلکہ آپ کے کلام میں "رندی و سرمستی ہے"۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ بھی نہیں، بلکہ ایک قسم کی "مستانہ روش" ہے۔ غرض کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ، آخر ہم بھی تو کچھ کہیں۔ بقولِ شاعر۔

ہم بھی مُنہ میں زبان رکھتے ہیں

سنیئے ہم کہتے ہیں، کہ خواجہ صاحب کے اندازِ بیان میں "البیلا پن ہے، البیلا پن، اور صرف البیلا پن"۔

یہ ظاہر ہے۔ کہ مولانا موصوف کی نثر نہ تو انشاء اللہ خاں کی نظم ہے جس میں شوخی ہو، نہ جان صاحب کی شاعری، جو بذاتِ خود ایک "غمزۂ سخن" ہے۔ نہ وہ آغا حیدر حسن کی نثر جس کو "باجی جان کی زبان" کہا جا سکے یا یہ کہا جائے۔ کہ "نئی نویلی دلھنیں ایسی ہی سہانی بولی بولتی ہیں"۔ نہ وہ مرزا فرحت اللہ صاحب کی نثر ہے۔ جس میں الفاظ اور جملے اس طرح بہتے نظر آتے ہیں کہ گویا جمنا ندی اٹکھیلیاں لے لے کر بہ رہی ہو۔ فرحت صاحب کے اسٹائل میں تو ایک قسم کا "تبسم پنہاں" ہے۔ خواجہ صاحب سے اُن کی نثر کا کیا مقابلہ۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کی زبان میں شوخی نہیں۔ بلکہ آزادی ہے۔ مستی نہیں بلکہ وارستگی کو دخل ہے۔ "رجائیت اور قنوطیت" تو ایسے کرخت الفاظ ہیں کہ خواجہ صاحب کی نثر کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال کرنا دراصل عربی زبان میں ایک قسم کی دشنام دینا ہے ٭

ہاں تو خواجہ صاحب کی نثر میں البیلاپن ہے۔ اس البیلے پن سے ہمارا مطلب زبان میں ایک قسم کی نزاکت، ملاحت، سلاست اور آزادی ہے۔ نزاکت بھی ایسی جو ہر خاص و عام کو بھلی معلوم ہو۔ ملاحت ایسی جس سے طبیعت میں آپ ہی آپ جذباتِ محبت پیدا ہونے لگیں۔ سلاست ایسی کہ بچہ جوان، بوڑھا، پڑھا، اَن پڑھ، مولوی، دہقان، غرض ہر شخص آپ کی زبان بغیر کسی تکلف کے سمجھ لے۔ آزادی ایسی کہ زبان میں کسی قسم کی بناوٹ کا شائبہ تک نظر نہ آئے ٭

مثال کے لئے کنھیا جی کے بچپن کا البیلاپن کافی ہے۔ اس "مکھن چور" کی باتیں کیسی البیلی ہوتی تھیں۔ ایسا ہی کچھ البیلاپن ہماری زبان کے کنھیا، دِلّی والے رسیا، حضرت خواجہ حسن نظامی کے اسلوبِ بیان میں ہے۔ اسلوبِ بیان جس کا مقابلہ ابھی تک کوئی نہ کر سکا۔ البیلاپن جس کا جادو خواجہ صاحب کے لفظ لفظ میں بھرا ہوا ہے۔ مثلاً لفظِ "دعوت" کے بجائے وہ صرف "بلاوا" استعمال کریں گے، جو خاص لوگوں سے لیکر عام لوگوں تک کی سمجھ میں آ سکے۔ اسی طرح اگر کسی کتاب کی ابتدا کریں گے۔ تو ایسے فقرے استعمال کریں گے۔ جو بہت عام فہم اور نہایت سادے ہوں۔ مثلاً "خدا کی حمد اور رسول کی تعریف کے بعد فقیر حسن نظامی عرض کرتا ہے"۔

خواجہ صاحب کے کلام میں پژمردگی کا نام تک نہیں۔ وہ تو موت کی ہچکی[1] پر بھی تشدید لگا کر ہچکّی کو ہنسی سے مُبدّل کر سکتے ہیں۔ اُن کا ادب نہ تو رُلانے کے لئے ہے۔ نہ محض ہنسانے کے لئے۔ بلکہ کام کی باتوں کی طرف بُلانے کے لئے ہے ٭

سید مقبول حسین احمد پوری

[1] ملاحظہ ہو ادبی دُنیا جلد ۳ سلسلہ ۱۹۳۱ء

جھوٹی قصیدہ گوئی

اگر آپ شعرا کی تاریخ کو ملاحظہ فرمائیں گے تو آپ کو مندرجہ بالا موضوع پر نظم و نثر کے لحاظ سے بکثرت مثالیں مل جائیں گی۔ شعرا میں سے جن بزرگوں نے اپنی اس کمزوری کا علاج کر لیا تھا ان کے دفاترِ شعر ایسی لغویات سے پاک و صاف ہیں ایسے آزاد شعرا یا تو خوشامد پسندوں کے دربار سے الگ رہے یا ظالموں کی تلوار کے نیچے بھی ان کی زبانِ حقیقت ترجمان کلمۂ دروغ سے آلودہ نہ ہوئی۔ یا انہوں نے قصیدہ گوئی تو کی مگر ایسے واعظانہ اور مصلحانہ رنگ میں کہ ان کی قصیدہ گوئی بجائے مجموعۂ خرافات ہو جانے کے اچھا خاصا دفترِ حقائق و معارف اور گنجینۂ پند و موعظت بن گیا۔ یا ایسا بھی ہوا ہے کہ خدا نے بااقتدار ممدوحوں ہی کو یہ سمجھ دے دی کہ انہوں نے مفت کی خوشامد اور بیکار باتیں بنانے سے اپنے مداحوں کو کھلم کھلا روک دیا۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ مشرق کا وہ زمانہ جب قصیدہ گوئی کا شباب تھا یعنی شاعری کی صنفِ قصیدہ کا مسلّمہ پیغمبر انوری زندہ تھا اس وقت بھی اس قسم کی قصیدہ گوئی کوئی قابلِ قدر صنفِ سخن نہ سمجھی جاتی تھی حتّیٰ کہ خود اسی پیغمبرِ قصیدہ کی آیاتِ شعری میں قصیدہ گو شعرا کے حق میں نازل ہوا تھا کہ انسانی جماعت میں قصیدہ گو شاعر کی اتنی بھی ضرورت نہیں جس قدر بھنگیوں اور خاکروبوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

آپ نے یقیناً حکیم الامۃ حضرت سعدی شیرازی کی کتابوں کی سیر کی ہے آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی "ہزلیات" کیسے ظہور پذیر ہوئیں۔ یہ سچ ہے کہ ہمیں سعدی ایسے بزرگ سے اتنی کمزوری کی بھی توقع نہ تھی لیکن یہ ہزلیات کا نام ہی بتاتا ہے کہ مصنف کی نگاہ میں ان چیزوں کی کیا وقعت تھی۔

لیکن اب ذرا سعدی کی نظم و نثر کے دیگر دفاتر پر بھی ایک نظرِ بازگشت ڈال لیجئے خصوصاً آپ کے قصیدہ کو دیکھیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بزرگ باپ اپنے با اقتدار بیٹے کو نہایت جانسوزی سے نصیحت پر نصیحت کر رہا ہے اور پندارِ ابوت میں اپنے قہار اور بگڑے ہوئے بیٹے کی خوئے قہاری کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور اپنے زمانہ کے جابرہ کو جب بھی مخاطب کرتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ اگر تم نے اپنے باپ سے نصیحت نہیں سنی "تو بشنو از عم" — یہی وجہ ہے کہ سعدی "چچا سعدی" کے

نام سے بھی ہندوستان کے اہل خبر طبقوں میں یاد کئے جاتے ہیں۔

سعدی کی نظیر سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اگر قصیدہ گوئی کی بھی جائے تو سعدی کی طرح کی قصیدہ گوئی یا مداحی کی جا سکتی ہے۔ لیکن سعدی کے مقابلہ میں ایسے قصیدہ گو بھی ہمیں نظر آتے ہیں کہ جن سے صاحبان تاج و تخت نے خواہش کی کہ وہ ان کی تعریف اور مدح میں قصیدہ گوئی اور مدح طرازی کریں لیکن انہوں نے برملا کہدیا کہ آپ پہلے کوئی کارنامہ دکھلیئے تو ہم بغیر آپ کی خواہش کے قصیدہ کہدیں گے۔

کہتے ہیں کہ جب شام کے نامور اموی سلطان بادشاہ عبدالملک بن مروان نے قریش کے مشہور شاعر عمر بن ربیعہ سے فرمائش کی کہ وہ اس کی مدح میں قصیدہ کہے تو قریشی شاعر نے بے دھڑک کہا کہ "میں صرف عورتوں کی مدح کیا کرتا ہوں"۔ اس شاعر نے تو قصیدہ کہنے سے انکار کر دیا مگر عباسی دور کے ایک دوسرے عرب شاعر "ابن میادہ" کا واقعہ ہے کہ اس نے منصور عباسی کی شان میں قصیدہ تصنیف کیا۔ چاہتا تھا کہ بغداد جائے اور دربار منصور میں اپنا قصیدہ مدحیہ پڑھے اور انعام واکرام سے مالا مال ہو کر اپنے وطن کو واپس آئے چنانچہ حسب وقت وہ بعزم بغداد نیار ہو کر بیٹھا تھا تو اس کا غلام حسب معمول اونٹنی کا دودھ اس کے لئے لایا۔ شاعر نے پیا اور دودھ پی کر خدا کا شکر کیا اور اطمینان سے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور کہا "اونٹنی کے اس دودھ کے ہوتے معاذ اللہ میں بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ کہا اور صلہ کی امید میں بغداد جاتا ہوں"۔ یہ کہا اور سفر بغداد ملتوی اور قصیدہ خوانی موقوف کر بیٹھا۔

یہ تو عرب کی باتیں ہیں اور عرب بھی آج کل کا نہیں بلکہ اُس وقت کا جبکہ غلاموں کی عادتیں عرب کے صحرا نوردوں میں پیدا نہیں ہوئی تھیں لیکن اگر آپ پرانی تاریخوں اور تذکروں کی سیر کرینگے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ کے انہی غلاموں کے ملک اور تعبد زدہ "ہندوستان" میں بھی ایسے ایسے شاعروں کے نام نظر آئیں گے جنھوں نے اگر یہ شعر کہا کہ ؎

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش　　آنچہ ما درکار داریم اکثری درکار نیست

تو اپنے اس قول کو اپنے عمل سے بھی سچا ثابت کر کے دکھا دیا۔

میرے ایک بزرگ دوست بیان کرتے تھے کہ حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں کسی تقریب سے حضرت مرزا عبدالقادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ کا یہی شعر پڑھا گیا۔ یہ شعر سن کر عالمگیر غازی نے باوجود اپنی روایتی شاعروں سے نفرت کے فرمایا کہ اگر بیدل میرے دربار میں حاضر ہو تو میں اسے خلعت و انعام سے مالا مال کر دوں۔ اورنگ زیب کا یہ فرمان ہوا میں نہیں جا سکتا تھا۔ دربار عالمگیری کے کسی درباری نے بیدل کو جا کر یہ مژدۂ جانفزا سنا دیا۔ لیکن اسے سن کر اس شہنشاہِ اقلیم قناعت نے جواباً کہا تو صرف اسی قدر کہ اپنا یہی شعر اپنی زبان سے پڑھ دیا۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش　　آنچہ ما درکار داریم اکثری درکار نیست

بیدل کی زندگی کے اس واقعہ کو تو شاید بے سند افسانہ سمجھ لیا جائے لیکن ہم عالمگیری دور کے فاضل اہل قلم امیر شیر علی خان کی قابل قدر تاریخی اور علمی کتاب "مراۃ الخیال" میں مرزا عبدالقادر بیدل کے حالات میں اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ لکھا ہوا پاتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اوائل شباب میں بعض مصالح کی بنا پر مرزا بیدل نے اورنگ زیب کے فرزند شاہزادہ محمد اعظم شاہ کی ملازمت اختیار کی تھی جہاں آپ کو ایک منصب عمدہ بھی حاصل تھا۔ ایک دن شہزادہ کے دربار میں شعرائے عصر کا مذکور آیا مقربان دربار میں سے کسی نے عرض کیا کہ بالفعل شاہجہان آباد ہی نہیں سارے ہندوستان میں مرزا عبدالقادر بیدل سے بڑھ کر جو سرکار میں ملازم ہیں دوسرا شاعر نہیں ہے۔ یہ سن کر شاہزادہ موصوف نے فرمایا کہ مرزا صاحب سے کہا جائے کہ ہماری مدح میں قصیدہ تصنیف کریں تاکہ ان کی طبیعت کا زور دیکھ کر ان کے منصب و تقرب میں اضافہ کیا جائے۔ یہ خبر مرزا صاحب کو بھی پہنچی۔ سنتے ہی آپ تخشی سرکاری کے گھر پر پہنچے اور اپنے منصب سے استعفیٰ پیش کر دیا۔ دوستوں نے بربنائے مصلحت شاہزادے کی مدح میں قصیدہ کہنے پر اصرار کیا۔ مگر مرزا صاحب نے ایک نہ مانی۔ انتہا یہ کی کہ ملازمت چھوڑ کر دم لیا"

یہ واقعہ لکھ کر امیر شیر علی خاں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"ازایں جاست کہ دیوانش ہست ہزار بیت خواہد بود و یک بیت مدح دراں داخل نیست" مرزا بیدل کی روح پر درود وسلام۔ بگرہاں مندرجہ بالا شعر کو ایک بار پھر پڑھا اور دیکھا کہ آپ کے استغنا کا کیا عالم ہے۔ اسی قناعت پیشگی کے متعلق مرزا صاحب کا ایک اور شعر بھی یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا ہے گو وہ شعر مندرجہ بالا شعر کے برابر تو نہیں مگر بیدل کی قناعت پسندی اور کوہ وقاری کا آئینہ دار ہے جسے پڑھ کر اس فخار الشعرا کے حق میں دعا اور اس کے کلام پر بے اختیار دل سے مرحبا نکلتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

دنیا اگر دہند نہ خیزم زجائے خویش ؎ من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

قرآن حکیم نے ایک جگہ دور لوگوں کے حق میں کہا ہے کہ یحبون ان یحمدوا بمالم یفعلوا۔ کہ وہ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان کی ایسے امور کے لئے تعریف کی جائے جو انہوں نے انجام نہیں دئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی کمزوریوں میں سے ایک بہت بڑی کمزوری یہی ہے کہ انسان اپنی تعریف کئے جانے کو عام طور پر پسند کرتا ہے۔ اور عموماً جھوٹی بات کو بھی جو تعریف کے پردہ میں کہی جائے گوارا کر لیتا ہے۔

حالانکہ جھوٹی بات جو تعریف کے رنگ میں کہی جائے اتنی ہی خراب اور قابل نفرت ہوتی ہے جس قدر کہ وہ جھوٹی بات جو ہجو کی صورت میں کہی جائے۔ ہجو گو جھوٹا اور جھوٹا مداح دونوں ایک ہی قسم کے گناہگار ہیں جو اپنے ایسے ایک

انسان کو اپنے وقتی اور محدود فائدہ کے لئے ایک شدید غلط فہمی میں ڈال کر بالکل برباد کر دیتے اور اسے اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے غافل کر دینے کے مجرم ہوتے ہیں۔ ورنہ طبقۂ اُمرا اور حکام میں بھی جو لوگ زندہ دل اور بیدار دماغ رکھنے والے ہوتے ہونگے وہ ضرور ایسی مداحیوں اور دروغ بافیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں گے کسی کا بیان ہے کہ جس وقت استادِ ذوق اپنے شاگرد اور ممدوح بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں قصیدہ پڑھا کرتا ہوگا تو غریب ظفر اپنے دل میں ضرور شرماتا ہوگا کہ مجھے جو اپنے ہی واداکے بنائے ہوئے لال قلعہ میں نظر بند ہوں کس طرح با این بیچارگی کشور کشا اور فاتح عالم ٹھہرایا جا رہا ہے اور مجھے جو انگریزوں کے ماہوار وظیفہ کی وصول یابی کا اپنے روزمرہ کے مصارف پورے کرنے کے لئے منتظر رہتا ہوں خزائنِ ارضی کا مالک اور حاتم سا دریا دل ٹھہرایا جا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بیان میں یقیناً حقیقت کی جھلک ہے کہ غریب ظفر اس حقیقت کو ضرور محسوس کرتا تھا جیسا کہ اس کے ان اشعار سے ظاہر و پیدا ہے۔ ذرا دیکھنا کس درد دل سے خدا کے حضور میں اپنی قلبی کیفیات پیش کر رہا ہے۔

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
ورنہ ایسا جو بنایا نہ بنایا ہوتا

خاکساری کے لئے مجھکو بنایا تھا اگر کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ذوق دیا تھا مجھکو عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دل کو میرے خم و خمخانہ بنایا ہوتا

اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیران کیا کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا
تونے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا

روزِ معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

سوال ہو سکتا ہے کہ ان احساسات کے باوجود کیوں ایسی جھوٹی مدح و ستائش سن لیتا تھا؟ تو اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ یہ اس زمانہ کا رواج تھا۔ کہ اس قسم کی منظوم مدحیات کو جو سراسر جھوٹ پر مشتمل ہوتی تھیں سوسائٹی میں عیب کی نظر سے نہ دیکھا جاتا تھا۔ ورنہ تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ طبقۂ اُمرا میں بھی ایسے مردانِ خود آگاہ ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے مداحوں کو طویل الذیل قصائد پڑھنے سے روک دیا اور اُن سے کہدیا کہ تم ایسی باتیں نہ کہو جنکا ہم پر اثر نہ ہو اور اتنی نہ کہو جن کو ہم خود بھی بھو

چاندنی رات

دو منظر

(نذرِ حسن)

وہ اُجلا سا میداں چمکتی سی ریت | اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے پتے چمکتے ہوئے | خس و خار سارے جھلکتے ہوئے
نشے کا سا عالم گلستان پر | وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر

(میر حسن دہلوی)

ابھی تک تیرے ساغر میں درخشاں ہے مئے باقی | ادر کاساً وناولہا الا یا ایہا الساقی
جم و کسریٰ کی عظمت گم ہے پارس کی زمینوں میں | زبانوں پر ہے اب تک داستانِ حسن و مشتاقی

(عابد لاہوری)

(۱)

وہ مہتاب کا نور وہ آب و تاب | کسی بت کے منہ پر سنہری نقاب
فضاؤں میں انوار کھوئے ہوئے | شعاعوں میں موتی پروئے ہوئے
وہ جلوے ہواؤں میں بکھرے ہوئے | وہ ذرّے گلستاں کے نکھرے ہوئے
وہ شبنم سے بھیگا ہوا سبزہ زار | کہ فرشِ زمرّد پہ ہیروں کے ہار
وہ جلووں میں نغمے وہ نغموں میں رنگ | کہ تارِ بریشم[۱] ہیں رگہائے سنگ

۱؎ بریشم۔ ریشم۔

وہ گلزار میں چاندنی کی بہار　　رواں ہر طرف نور کے آبشار
وہ چاروں طرف نور چھایا ہوا　　وہ سارا جہاں جگمگایا ہوا
وہ راوی کی لہروں پہ کرنوں کا ناچ　　کوئی جس طرح گا رہا ہو کھماچ[1]
وہ پانی میں عکسِ گُلِ ماہتاب　　کہ جیسے کنول میں کھلا ہو گلاب
اب اک اور تشبیہ دوں بے مثال　　سمندر میں چاندی کے سونے کا تھال
وہ لہروں پہ کرنوں کی سیمیں لڑی　　کوئی جس طرح چھوڑ دے پھلجھڑی
کشاکش وہ موجوں کی وہ پیچ و خم　　حسینوں کی یا ہاتھا پائی بہم

کوئی باغ میں گا رہا ہے بہاگ[2]
بھڑکنے لگی میرے سینے میں آگ

وہ گت میٹھی میٹھی وہ لَے دردناک　　کہ ہو جائے دامانِ دل چاک چاک
وہ آواز میں لوچ وہ سوز و ساز　　کہ پتھر کے دل میں ہو پیدا گداز
لگاتا ہے اس طرح سے کوئی تان　　کہ ہر تان کے ساتھ کھنچتی ہے جان
کسی نے وہ گائی غزل رقت ریز　　کہ نبضِ جنوں جس سے ہو جائے تیز

جوانی گئی زندگانی گئی
محبت کی رنگیں کہانی گئی

خدایا وہ دنیا بھی ہو گی کہیں　　جہاں عشق کی بات مانی گئی
نہ پایا کسی نے محبت کا بھید　　بہت دیر تک خاک چھانی گئی
مبارک ہے میری جوانی کی موت　　کہ یوں آپ کی بدگمانی گئی

---

[1] کھماچ ۔ راگنی کا نام ہے ۔ [2] راگ ہے جس کا محل اس کی یہ ہے کہ ایک جوگی سوز و گداز کے عالم میں دردناک لے میں گا رہا ہے

ہوا اُن سے جس دن سے عابد جُدا
غزل کی وہ رنگیں بیانی گئی

(۲)

وہ دریا کنارے درختوں کی شان
کسی سلطنت کے جواں پاسبان
بلندی کی ہر شان سے ارجمند
سرآوردہ و سرکش و سربلند
گھنے ان کے سائے وہ ظلمت نگار
جہاں چاندنی کا نہیں ہے گذار
یہاں آبِ دریا بھی خاموش ہے
کسی خوف سے موج رُوپوش ہے
یہاں گرمیٔ نغمہ وئے نہیں
سکوں کے سوا کوئی بھی شے نہیں
صفیں وہ درختوں کی دونوں طرف
کہ دیووں کی فوجوں نے باندھی ہو صف
یہاں گم ہوئی موج کی بے کلی
یہاں آکے دریا نے چپ سادھ لی

یہاں دیر سے حکمراں ہے سکوت
یہاں کارواں کا رواں ہے سکوت

(۳)

یہ دونوں مناظر ہیں یکسر فریب
(اگرچہ بہت رُوح پرور فریب)
فریبِ نظر ہیں بہار و خزاں
فریبِ نظر ہیں زمین و زماں
فریبِ تخیل ہے کُل کائنات
فریبِ تخیل ہے موت و حیات

فریبِ تخیل ہے بزمِ شہود
بس اک ذات ہے اسکی اصلِ وجود

عابد

میرا حریف

میرا ایک دوست تھا جو میرا حریف تھا' میری کوششوں کا حریف نہیں' نہ میرے کاروبار کا' نہ میری محبت کا' بلکہ بات یہ تھی کہ کسی موضوع کے متعلق بھی کبھی ہمارا نقطۂ نظر ایک نہ ہوتا تھا' اور جب کبھی ہم ملتے تھے ہمارے درمیان ایک نامتناہی بحث کا سلسلہ چھڑ جاتا تھا۔

ہم ہر چیز کے متعلق بحث کیا کرتے تھے۔ آرٹ کے متعلق' مذہب کے متعلق اور سائنس کے متعلق' دنیاوی زندگی کے متعلق اور آئندہ زندگی کے متعلق' خصوصاً آئندہ زندگی کے متعلق۔

وہ مذہب اور عقل کا قائل تھا ایک دن اس نے کہا "تم ہر بات پر ہنس دیتے ہو لیکن اگر میں تم سے پہلے مر گیا تو میں دوسری دنیا سے تمہارے پاس آؤں گا ..... دیکھیں تم پھر بھی ہنستے ہو یا نہیں"!

اور وہ سچ مچ مجھ سے پہلے مر گیا' حالانکہ وہ ابھی جوان تھا' لیکن زمانہ گزرتا گیا اور مجھے اس کا وعدہ اکثر بھول گیا۔

ایک رات میں اپنے بستر میں لیٹا ہوا تھا اور مجھے نیند نہ آتی تھی بلکہ میں خود ہی سونا نہ چاہتا تھا۔

کمرے میں نہ اندھیرا تھا نہ روشنی۔ شام کے دھندلکے کو میری نظریں پھاڑ پھاڑ کر گزر رہی تھیں۔

یکایک مجھے یوں معلوم ہوا جیسے دونوں کھڑکیوں کے درمیان میرا حریف کھڑا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اور اندوہگیں انداز میں اپنے سر کو اوپر اور نیچے جنبش دے رہا ہے۔

میں بالکل خائف نہ ہوا' بلکہ مجھے حیرت بھی نہ ہوئی ..... لیکن میں نے اپنی کہنی کا سہارا لیتے ہوئے سر کو بستر میں ذرا بلند کیا اور اس غیر متوقع وجود کی طرف زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔

وہ اُسی طرح اپنے سر کو ہلاتا رہا۔

آخر میں نے کہا "ہاں اب بتاؤ تم مسرور ہو یا متاسف! یہ تم اپنا سر کس لئے ہلا رہے ہو! کیا یہ انتباہ ہے یا طعنہ زنی؟ ..... یا تم مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ تم غلطی پر تھے! یا ہم دونوں غلطی پر تھے! تمہیں کیا ملا ہے! دوزخ کا عذاب یا بہشت کی مسرت! کم از کم ایک لفظ ہی منہ سے بولو"!

لیکن میرے حریف کے لبوں کو ذرا حرکت نہ ہوئی اور وہ بدستور عاجزانہ اور غمگین انداز سے اپنے سر کو ہلاتا رہا۔

میں ہنس پڑا ..... وہ غائب ہو گیا +

(از جنیف)۔

منصور احمد

خیرات

طوری ایران کا شہزادہ تھا، بڑا امیر، بڑا عالم اور اس کی دانشمندی کا بڑا شہرہ تھا۔

اس کا ایک محل تھا جس کی دیواروں پہ زر و جواہر کو تراش تراش کر پھول بوٹے بنائے گئے تھے اور اس کے کئی باغ تھے جن کے پھول اور درخت اتنے خوبصورت تھے کہ ان پر زر و جواہر کا دھوکا ہوتا تھا۔

وہ حسین عورتوں کی بڑی خاطر مدارات کرتا مگر اُن سے اُس کی کوئی غرض وابستہ نہ ہوتی۔ وہ صرف یہ چاہتا کہ وہ حسین ہوں اور خوبصورت لباس میں ملبوس نظر آئیں۔ ان کے تلوّن اور جہالت سے اُسے کوئی پرخاش نہ ہوتی۔

وہ شاعروں کی بڑی خاطر مدارات کرتا مگر اُن سے اُس کی کوئی غرض وابستہ نہ ہوتی۔ وہ صرف یہ چاہتا کہ جب خیالات اُن کے دلوں میں پیدا ہوں تو وہ نظمیں اور غزلیں لکھا کریں۔ اور جب ان کے شعر اچھے نہ ہوتے تو اسے اُن سے کوئی پرخاش نہ ہوتی۔

وہ فلسفیوں کی بڑی خاطر مدارات کرتا مگر ان سے اس کی کوئی غرض وابستہ نہ ہوتی۔ وہ صرف یہ چاہتا کہ وہ اس کے ساتھ مل کر خدا کی فطرت اور دنیا کی حقیقت کے متعلق بحث کیا کریں۔ اور اگر ان کی بحثیں کبھی معقول نہ بھی ہوتیں تو اُسے ان سے کوئی پرخاش نہ ہوتی۔

× × × × × × × × ×

موسم بہار کی ایک صبح کا ذکر ہے، طوری شیراز کے بڑے بازار میں سے گزر رہا تھا۔

تاجروں کے چھکڑوں میں سنگتروں کے انبار اور گلاب کے ڈھیر، اور گزرنے والے ہجوم کی نیلی، سرخ، سبز پوشاکیں بازار کی روشنی میں چمک رہی تھیں، چمپا کی شاخیں صحنوں کی دیواروں کے باہر لٹک رہی تھیں اور پانی چشموں میں سے ابل ابل کر ایک دھیما دھیما نغمہ پیدا کر رہا تھا۔

عورتوں کے چہرے ٹھنڈی ٹھنڈی شبنم سے بھیگے ہوئے پھولوں کی طرح شگفتہ تھے، اور ان کے لباسوں سے نہایت تیز خوشبوئیں آ رہی تھیں۔

اوران خوشبوؤں ان رنگوں اوراس مسرتِ بے پایاں سے طوری کو اپنے بوڑھے جسم میں ایک روح بھرتی ہوئی محسوس ہوئی گزرے ہوئے دنوں کی یاد اُسے خوشگوار معلوم ہونے لگی؛ اسے دنیا کا کارخانہ بے عیب نظر آنے لگا اور اُس نے تقریباً یقین کرلیا کہ زندگی زندہ رہنے کے قابل ہے۔

وہ بے اختیار پکار اٹھا:۔

"ہوا کتنی خوشگوار ہے! اور دن کتنا روشن ہے!"

x x x x x x x x x x

اُسے پانچ برس کی ایک چھوٹی سی خوب صورت لڑکی نظر آئی، سفید اور گلابی چہرے والی اور اس نے ایک چھوٹی سی قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ ایک انگلی اپنے منہ پر رکھ کر اپنے چمکیلے بالوں کے جال میں سے طوری کی طرف دیکھ رہی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی شاندار داڑھی کو یا اُن پُراسرار جانوروں کو جو اس کے لبادے پر کڑھے ہوئے تھے دیکھ دیکھ کر متعجب ہو رہی ہے۔

اور چونکہ وہ خوبصورت تھی طوری نے جھک کر اس کو گلے سے لگا لیا اور سونے کی دو اشرفیاں اس کے ننھے سے ہاتھ پر رکھ دیں۔

پھر اُسے دس برس کا ایک چھوٹا سا لڑکا نظر آیا۔ بچہ بدصورت تھا۔ اس کے بدن پر چیتھڑے لٹک رہے تھے اور اس کی چپٹی ناک سراسر داغوں اور دھبوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں گدلے پانی کی طرح دھندلا رہی تھیں اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور تیز آواز میں اس طرح بولا جیسے کوئی اپنا سبق سنا رہا ہو مگر اس کا خیال کہیں اور ہو۔ اس نے کہا "میری ماں بیمار ہے اور میرے سات چھوٹے چھوٹے بھائی ہیں اور مجھے تین دن سے کھانا نہیں ملا"

طوری نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے ایک اشرفی اس کی طرف پھینک دی۔

بیس قدم کے فاصلے پر اسے ایک بوڑھا نظر آیا گودڑ میں لپٹا ہوا لولا اور غلیظ اور زخمی کتے کی طرح زمین پر پڑا ہوا۔ اس کی داڑھی زرد رنگ کی تھی۔ بُری طرح دھوئی ہوئی سن کی طرح، اور اس کی سُرخ آنکھیں جن پر بھویں نہ تھیں گلی ہوئی انجیروں میں شگافوں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ بھاری آوازیں جیسی پھٹے ہوئے ڈھول میں سے نکلے آہستہ اور بلا وقفہ، ختم ہوتے ہی دوبارہ شروع کرتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"غریب آدمی پر رحم کرو، اپاہج پر رحم کرو۔ خداوند ارحم تمہیں اس کا بدلہ دے گا"

اور اس کی صدا کے متعفن سانس میں سے سڑی ہوئی شراب کی بو آتی تھی۔

طوری نے ایک اشرفی اس کی طرف بڑھا دی لیکن اتنی دور سے کہ وہ زمین پر گر پڑی اور بوڑھے فقیر کو اُسے اٹھانے کے لئے نہایت تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک لمحے کے بعد طوری نے ایک عورت کو دیکھا جس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آیا وہ جوان ہے یا بڈھی۔ اُس نے کندھے پر ایک نوزائیدہ بچہ اٹھا رکھا تھا جس کا بدن پھوڑے اور پھنسیوں سے بھرا ہوا تھا۔ راستے کی خاک کی طرح افتادہ اور اتنی جھکی ہوئی کہ اس کی آنکھیں بھی نظر نہ آتی تھیں وہ نہایت کمزور آواز میں بھیک مانگتی ہوئی طوری کا پیچھا کرنے لگی۔

بدمزاجی کی وجہ سے نہیں بلکہ تنگ آکر طوری نے ذرا قدم بڑھا کر چلنا شروع کیا' لیکن سیہ بختی اور بدنصیبی کا یہ پیکر بھی اس کے تعاقب میں رہا۔ اس نے اپنے بٹوے کو ٹٹولنا شروع کیا' لیکن اب اس میں کوئی سنہری سکہ باقی نہ رہا تھا آخر اس نے غصے سے ہاتھ کو جھٹک کر تانبے کے چند سکے عورت کی طرف پھینکے۔

پھر کوئی تیس قدم کے فاصلے پر اس نے اپنے سامنے ایک آدمی کو دیکھا جس کے نہ بازو تھے نہ ٹانگیں اور وہ ایک دیوار کے سہارے پڑا ہوا تھا۔ وہ نہایت غمگین بلند اور بے سُری آواز میں فردوسی کی ایک غزل گا رہا تھا جس میں بہار کے پرندوں اور پھولوں کا ذکر تھا؛ اور اس کے منہ سے ان اشعار کو سن کر خوف طاری ہوتا تھا۔

طوری پہلے ٹھہر گیا لیکن چونکہ کسی طرح بھی یہ آدمی اس کا تعاقب نہ کر سکتا تھا وہ اسے نظر انداز کر کے سڑک کے دوسرے کنارے سے گزر گیا۔

وہ کچھ دیر چلتا رہا لیکن اب اسے زندگی میں کوئی مسرت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس نے بلند آواز میں کہا:

"آج کی دھوپ ناقابل برداشت ہے!"

اور وہ اپنے محل کو واپس چلا گیا۔

x x x x x x x x x

پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنے میر ساماں کو بلایا اور اس سے کہا:

"بڑے بازار میں جاؤ۔ تمہیں ایک بڈھا فقیر ملے گا' اسے ایک اشرفی دینا۔ پھر ایک غریب عورت ایک بچے کو اٹھائے ہوئے نظر آئے گی' اسے دو اشرفیاں دینا؛ اور اس کے بعد ایک آدمی بازوؤں یا ٹانگوں کے بغیر ملے گا اُسے تین اشرفیاں دینا۔"

لیکن اُس دن کے بعد جب کبھی طوری شہر میں جاتا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ایک نوکر اس کے آگے آگے چلتا تھا جو تمام فقیروں کو روپیہ بانٹتا جاتا تھا اور انہیں راستے سے ہٹ جانے کا حکم دیتا جاتا تھا تاکہ اس کے آقا کی نظر اُن پر نہ پڑے۔

اور نیک دل طور پر روز بروز زیادہ مخیر اور زیادہ فیاض ہوتا گیا۔ لوگ سمجھنے لگے کہ شاید اس نے قسم کھائی ہے کہ شیراز میں اب کوئی غریب نہ رہے۔ اس کے محلوں کے نیچے ہر روز کھانا اور روپیہ تقسیم ہوتا تھا۔ اس نے ایک شفاخانہ بچوں کے لیے، ایک بوڑھوں کے لئے، ایک عورتوں کے لئے، اور ایک کمزوروں اور ناتوانوں کے لئے قائم کیا۔

اور اگر کبھی اسے بتایا جاتا کہ فلاں شخص نے جھوٹ موٹ اپنے آپ کو بیمار یا غریب ظاہر کر کے فریب کے ساتھ مدد حاصل کر لی ہے تو وہ کہا کرتا۔

"مجھے مت ستاؤ۔ میرے پاس حق کی تلاش کے لئے وقت نہیں ہے، نہ اسے باطل سے تمیز کرنے کی مجھے فرصت ہے۔"

چنانچہ اس طرح اس نے اپنی بے حساب دولت کا ایک بہت بڑا حصہ خلق خدا کی بہتری پر صرف کر دیا۔ اس نے اپنے محلات کی شان و شوکت بھی کم کر دی، اور عورتوں میں سے سب سے کمسن عورت اور شاعروں میں سے سب سے سُست شاعر اور فلسفیوں میں سے سب سے وہمی فلسفی کے سوا اس نے سب کو جواب دے دیا۔

لیکن دوسری طرف نہایت آرام و آسائش کی زندگی شروع کر دی۔ وہ ہر وقت شعر، موسیقی اور حسن کی فضا میں گھرا رہتا، اور کبھی اُن شفاخانوں میں نہ جاتا جن کو اس نے قائم کیا تھا، نہ اُن ایوانوں کو دیکھتا جہاں اس نے غریبوں کا پیٹ بھرنے کو لنگر جاری کر رکھے تھے۔

ایک دن وہ شہر میں سے گزر رہا تھا کہ غریب آدمیوں کے ایک گروہ نے اُسے گھیر لیا۔ یک زبان ہو کر وہ سب کہہ رہے تھے کہ تیرے ہی فیضِ عام کے طفیل ہماری زندگی قائم ہے، اور جھک جھک کر اس کی قبا کا دامن چومتے جاتے تھے لیکن وہ ناراض ہو گیا۔ یوں معلوم ہوا جیسے یہ اظہارِ امتنان اسے ناگوار گزرا ہے اور اسے اس سے تکلیف پہنچی ہے۔

اور لوگ اسے ایران کا مقدس ترین اور معزز ترین انسان سمجھتے تھے۔

جب اس کی موت قریب آئی تو اس نے تمام فلسفیوں کو رخصت کر دیا اور اپنے پاس سولہ سال کی صرف ایک حسین لڑکی کو رہنے دیا اور اس سے کہا کہ وہ چپ چاپ اپنی نیلوفر کے پھولوں جیسی نھری آنکھوں سے صرف اس کی طرف دیکھتی رہے۔

وہ مر گیا۔

ایران کے غریب لوگ یعنی وہ جو کسی زمانے میں غریب تھے سب اس کے جنازے میں شریک ہوئے، اور ان میں سے اکثر رو رہے تھے۔

x x x x x x x x

زمان و مکان سے پرے شکل وصورت سے پرے ـــــ کہاں ؟
مجھے معلوم نہیں نہ کسی اور کو معلوم ہے۔ مگر طوری کی روح ارمز کے سامنے حساب و کتاب کے لئے پیش ہوئی۔
ارمز نے اس سے پوچھا "تم نے زمین پر کیا کچھ کیا ؟ اپنے اعمال ہمیں بتاؤ"
یہ سوال سن کر طوری کو کوئی پریشانی لاحق نہ ہوئی۔ اس کا دل مطمئن تھا۔ اس نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ جواب دیا۔

"بلا شبہ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے مجھ میں کمزوریاں بھی تھیں حسین صورتیں خوبصورت رنگ، رسیلے راگ اور روح پرور خوشبوئیں مجھے مسرت بخشتی تھیں خوشگوار ملاقاتوں اور بے حاصل گفتگوؤں میں مجھے لطف آتا تھا لیکن میں نے اپنے ذاتی اخراجات میں سے چار شفا خانے تعمیر کرائے۔ میں نے اپنے ساز و سامان اور دولت کے نو حصے غریبوں کو دئیے اور صرف دسواں حصہ اپنے لئے رکھا"

ارمز نے کہا "یہ صحیح ہے کہ تم کچھ بُرے آدمی نہ تھے اور تم میں نیکی کا جذبہ موجود تھا مگر اس کے باوجود تم ابھی جنت میں داخل نہ ہو سکو گے۔ بلکہ تمہاری روح ایک اور جسم کا جامہ پہن کر دنیا میں جائے گی تاکہ تم کچھ اور سیکھنے اور کچھ اور تجربہ کرنے کے لئے وہاں ایک نئی زندگی بسر کرو"

طوری بہت حیران ہوا اور اس نے پوچھا۔
"میرے آقا مجھے اب اور کیا سیکھنا ہے ؟"

"اپنے آپ پر غور کرو اور اپنے نفس پر نگاہ ڈال کر سوچو کہ جب تم اپنا مال و دولت غریبوں کو دیا کرتے تھے تو تمہارے خیالات کیا ہوا کرتے تھے۔ اور جس دن تم اُس بوڑھے فقیر اور اُس زرد رو عورت اور اس کے بچے اور اُس بے دست و پا انسان سے ملے تھے اس دن تم نے اپنے دل میں کیا محسوس کیا تھا ؟"

طوری نے کہا "انسانی دکھ کے لئے بے اندازہ رحم"

ارمز نے کہا "تم جھوٹ بولتے ہو۔ ان کو دیکھ کر سب سے پہلے تمہارے دل میں ایک ناگوار گھبراہٹ پیدا ہوئی تھی۔ رنج اور مصیبت کے وجود کو اس وقت تم نے نہایت تلخی کی نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر تم نے ان کو ذلیل سمجھا کیونکہ اُن کی بدوضعی اور ناپاکیزگی نے تمہاری آنکھوں کو خوش نہ کیا۔ ان کی فروتنی اور عاجزی سے بھی تم نے نفرت کی اور مانگنے کے اس کمینہ انداز سے اور ان کی ختم نہ ہونے والی اور مسلسل التجاؤں سے تم خفا ہو گئے۔ اور تم

نے حقارت کے ساتھ خیرات کو ان کی طرف پھینکا۔ تم نے دل سے اتنی نفرت کی کہ تم ان کی شکر گذاری کو بھی برداشت نہ کر سکے۔ عوام کی بے ڈھنگی مصیبتوں سے تم چڑ گئے اور تمہارے مزاج کی نفاست نے اُن سے اُن کے اِس حق کو بھی چھین لیا کہ وہ اپنے اظہارِ شکر سے اپنے آپ کو تمہاری مہربانیوں کا اہل ثابت کر سکیں۔ تم نے غربت کو اس لئے مٹانا چاہا کہ تمہارے خیال میں یہ دنیا کے دامن پر ایک دھبا تھا اور زندگی کی توہین تھی۔ لیکن میں جس کی نگاہ ضمیروں کی گہرائی تک پہنچتی ہے جانتا ہوں کہ تمہاری خیرات میں "تلخی اور نفرت شامل تھی"۔

طوری نے کہا "لیکن مجھے غریبوں سے تو نفرت نہ تھی، مجھے تو مصیبت سے نفرت تھی جو شر کا مظہر تھی، جو اہرمن تھی، اہرمن جو خداوند کا ازلی دشمن ہے"۔

ارمز نے کہا "اہرمن میں ہی تو ہوں"۔

"میرے مالک، تو کیا کہتا ہے؟"

"میں ہی اہرمن ہوں، کیونکہ میں ارمز ہوں، نیکی ہمیشہ شر سے پیدا ہوتی ہے، آرام ہمیشہ مصیبت سے پیدا ہوتا ہے"۔

"میرے آقا، کیا تیرے مدعا کی بہترین تکمیل یوں ہی ہوتی ہے؟"

"ادب! اے نادان، شر معدوم ہو جانے والا ہے۔ یہ صرف آسودگی اور نیکی کی تخلیق کے لئے موجود ہے جب یہ زمین جس پر یہ تجربہ کیا جا رہا ہے مٹ جائے گی، جب تمام حق پرست روحیں میرے پاس پہنچ جائیں گی تو ایسا معلوم ہوگا گویا شر کبھی موجود ہی نہ تھا"۔

"تیرا ارشاد بجا ہے لیکن مجھے یہ تو معلوم ہو کہ میرے معاملے میں اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اُن لوگوں کی طرف دیکھ کر جن کا نظارہ گویا نگاہ کا جہنم تھا، میں اَور کیا محسوس کر سکتا تھا! اور اس سے زیادہ میں اَور کیا کرتا کہ میں نے ان کو مصیبت سے نجات دلا دی؟"

"یہی معلوم کرنے کے لئے میں تجھے آج پھر دنیا میں بھیج رہا ہوں"۔

"لیکن، خداوند . . . ."

طوری کا فقرہ ختم نہ ہو سکا۔ اب نہ ارمز تھا . . . . . نہ طوری . . . . . بلکہ ایک خلائے بے پایاں . . . . .

× × × × × × × × ×

ولیرد کی ساری زندگی نہایت بے کیف اور رنجیدہ تھی۔

وہ ایک گنوار اور اکھڑ خاندان میں پیدا ہوا جن کا پیشہ دستکاری تھا۔ اس کی پرورش نہایت افلاس کی حالت

میں ہوئی اور اکثر وہ پٹتا بھی رہا۔اس نے ایک ایسا پیشہ سیکھا جس سے وہ تمام عمر تکلیف میں رہا۔غریبوں کی بعض خوبیاں بھی اس میں موجود تھیں! وہ خاصا دیانت دار، خاصا نیک اور خاصا متوکل آدمی تھا۔لیکن نہ اس میں غرور تھا نہ شائستگی جو روح کی مسرت ہے۔

اس نے صرف تنہائی کو کھونے کے لئے شادی کی۔اسے اکثر کام نہ ملا۔اس کی بیوی اور اس کے دو بچے افلاس کی مصیبت سے مر گئے۔ایک دن وہ ایک مچان پر سے گر پڑا اور اچھی طرح غور و پرداخت نہ ہونے کے باعث دونوں ٹانگوں سے معذور ہو گیا۔اس کا ایک بازو بے حس ہو گیا اور دوسرے پر ایک غیر اندمال پذیر زخم پڑ گیا۔

اب مانگنے کے سوا اس کے لئے کوئی چارہ نہ رہا۔اول اول وہ اس کام کو اچھی طرح نہ کر سکا۔اسے شرم آتی تھی، وہ اصرار نہ کر سکتا تھا اور بمشکل اسے کچھ ملتا تھا۔

آہستہ آہستہ اسے ہاتھ پھیلانے کی عادت ہوئی مسکنت اور عاجزی کے اظہار کی عادت، التجائیں کرنے کی عادت جس سے گزرنے والے تنگ آجائیں۔اس کے بعد اسے کافی روزی مل جاتی تھی اور اسے فاقوں سے مرنے کا کوئی خطرہ نہ رہا تھا۔

اور چونکہ دنیا میں اسے کوئی خوشی نہ تھی اس لئے جب کبھی اس کے پاس چند پیسے جمع ہو جاتے تھے وہ ان کی شراب پی لیتا تھا۔نہایت ادنیٰ درجے کی بدبودار شراب۔

x x x x x x x x x

ایک بہت ہی غریب لڑکی جو اس کے قریب ہی ایک کوٹھری میں رہتی تھی اکثر اس سے ملا کرتی تھی اور اس پر رحم کھا کر اس کے کام کر دیا کرتی تھی۔

وہ ہر صبح آکر اس کے زخم دھلاتی تھی، اس کا بستر بچھاتی تھی، اس کے لئے کھانا تیار کرتی تھی اور کپڑوں کی مرمت کرتی تھی۔اور یہ سب کچھ بلا معاوضہ بے غرض۔

اس کا نام کریمہ تھا۔وہ خوبصورت نہ تھی لیکن اس کی آنکھیں اتنی اچھی تھیں کہ انسان چاہتا تھا ان کی طرف دیکھتا ہی رہے۔

اور خبر نہیں کیوں طیرد ہر صبح اپنے بوریا پر بیٹھ کر اس ساعت کا انتظار کیا کرتا جب کریمہ بیدار ہو کر کھڑکی میں آکھڑی ہوا کرتی۔

x x x x x x x x x x

ایک دن طیرو حسبِ معمول بھیک مانگ رہا تھا کہ ایک شخص نے نہایت حقارت کے ساتھ اس کی طرف ایک اشرفی پھینکی۔ اُس وقت ارمزنے طیرو کی روح پر سے پردہ اٹھا دیا اور ایک لمحے کے لئے اسے یاد آگیا کہ یہ وہی اشرفی ہے جو طوری نے حقارت کے ساتھ ایک فقیر کی طرف پھینکی تھی۔ اور طیرو اس امیر آدمی کی آنکھوں میں نفرت کی جھلک دیکھ کر سمجھ گیا کہ طوری ارمز کی طرف سے کیوں مقہور ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ اپنی پہلی زندگی میں اگرچہ اس نے غریبوں کی داد رسی کی تھی لیکن ان کی عاجزی اور بد وضعی کے لئے اور اُن وجوہ کے سے جن کے ذمہ دار وہ نہ تھے نفرت کا اظہار بھی کیا تھا۔

دوسرے دن جب کریہ اس کے زخم دھلانے آئی تو وہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی بغیر کسی نفرت کے اس کے زخم دھو رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں نرمی اور آسودگی جھلک رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ یہ نوجوان لڑکی جو اس کی مرہم پٹی کر رہی تھی اور اس سے نفرت نہ کرتی تھی باوجود اس کے کہ وہ اپنے فرقے میں سب سے زیادہ کریہ المنظر تھا حقیقت میں نیک اور شریف تھی۔

جب لڑکی نے اپنا کام ختم کر لیا تو طیرو نے خاموشی کے ساتھ اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور رونے لگا۔ اُس وقت ارمز نے اس کے لئے موت کا تحفہ منظور کیا اور وہ اُسی رات مر گیا۔

× × × × × × × ×

ارمز نے طوری طیرو کی روح سے سوال کیا "ہاں بتاؤ تم کیا سمجھے"؟

"میں یہ سمجھا میرے آقا کہ ہمیں غربت میں غریبوں کی مدد کرنی چاہئے۔ ہمیں ان کی روح میں نظر کرنی چاہئے اور ان کی ذلت اور پست فطرتی پر جس کے لئے وہ اپنی احتیاج کی وجہ سے مجبور ہو گئے ہیں ان سے نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ ان سے محبت کرنی چاہئے۔ کم از کم ان کی محرومی کے لئے، وہ جن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور جن کا متحدہ غصہ امیروں کو گھاس کے تنکوں کی طرح اڑا لے جا سکتا ہے۔ اور آخری بات یہ کہ ہمیں جستجو کرنی چاہئے شرافت اور وقار کی اُس رمق کے لئے جو اُنکی روح میں باقی رہ گئی ہو اور ہمیں نہایت فروتنی سے ان کی خدمت کرنی چاہئے۔ اور جس طرح ہم اپنی مصائب کی طرف توجہ کرتے ہیں اُسی طرح بغیر کسی کراہت کے دوسروں کی مصائب کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئے جب ہم ان کو کسی ابتلا سے نجات دلائیں تو ہمیں ان کی مصیبت کے خلاف بغاوت نہیں کرنی چاہئے بلکہ اس طرح اسے قبول کرنا چاہئے جس طرح ایک شریف انسان اُس بزرگ و برتر ہستی کے پُراسرار منصوبوں کو قبول کرتا ہے جو سربانت کا باعث جاننے والی ہے۔ کیونکہ کائنات کا مقصد حسن کی تخلیق نہیں ہے۔ بلکہ نیکی کی تخلیق ہے"۔

ارمز نے کہا "ٹھیک ہے۔ نیک بندے بہشت میں داخل ہو جا"۔

(تزان نو دیے)

منصور احمد

ناتمامی

درست ہو نہ سکے کائنات کے اجزا — حیات گرچہ رہینِ سد اضطراب رہی
اصولِ رزم سکھائے نظامِ بزم دیا — نگاہِ شوخ بنی محرمِ حجاب رہی
کبھی ترانۂ آغاز و گاہ حزنِ مآل — سکوتِ پیری و ہنگامۂ شباب رہی
کہیں فضائے تبسم میں اشکباری کی — فسردگی میں کبھی صرفِ آب و تاب رہی
کمالِ ناز بنی نازشِ کمال ہوئی — نقابِ راز اٹھایا تہِ نقاب رہی
نوائے مرغِ گلستاں کو دردمند کیا — کلی کی طرح کھلی صورتِ گلاب رہی
خوشی کے راگ سنائے سرشکِ درد بہائے — پیامِ امن ہوئی درسِ اضطراب رہی
سحر کی بزم میں چھیڑا سرودِ بیداری — فضائے شام میں وقفِ نشاطِ خواب رہی
دلوں کو سوزِ محبت سے بہرہ مند کیا — حدیثِ مطرب و کیفِ شرابِ ناب رہی
کبھی تبسمِ دلکش کہیں نگاہِ عتاب — سکونِ ماہ بنی جوشِ آفتاب رہی
ہزار بار جلائے چراغِ امن و سکوں — ہزار مرتبہ سرگرمِ انقلاب رہی
کبھی دلوں کو سنایا پیامِ عیشِ ابد — فنا کی زد میں کبھی صرفِ پیچ و تاب رہی
غرض ہزار طریقوں سے دورِ گیتی میں — ستیزہ کار ہوئی موردِ عذاب رہی
مگر بایں ہمہ سعی و عمل گرہ نہ کھلی — حیات موت کے ناخن کی زخم یاب رہی

ہجومِ ظلمتِ روزِ سیاہ ہو کے رہا
مآلِ کار گلستاں تباہ ہو کے رہا

علی اختر

طلسمِ زندگی

صوفی، شاعر، ظریف، فلسفی ـــ یہ ہے "طلسمِ زندگی" کا مصنف اور اگر کسی کی تحریر سے کسی کی شخصیت کے متعلق قیاس کرنا ممکن ہے تو پھر صاحبِ "طلسمِ زندگی" کا تعارف اس سے زیادہ موزوں اور اس سے زیادہ مجمل الفاظ میں نہ ہو سکتا تھا۔

"طلسمِ زندگی" کے نام سے میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر "ہمایوں" کے مختصر مضامین کا مجموعہ حال میں شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب معنی و صورت دونوں پہلوؤں سے پڑھنے والے کو ایک فوری کشش کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کیونکہ کتاب کے ظاہر و باطن دونوں کے اہتمام میں یکساں نفاست اور سلامتِ ذوق سے کام لیا گیا ہے۔ ایک مختصر سی تمہید اور ایک دلاویز دیباچے کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ یہ چھ ابواب پر مشتمل ہے جن کی تقسیم ان کے تنوعِ مباحث کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ کتاب کے متنوع مضامین پہلی ہی نظر میں ظاہر کر دیتے ہیں کہ کتاب مجموعی طور پر محض تفریحی، ادبی، محض اخلاقی و فلسفیانہ یا محض اصلاحی و تبلیغی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ہر بات میں مصنف نے ایک مختلف موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ کتاب کے صفحات میں ہمیں اس قسم کی بوقلموں دلچسپیوں کا عکس نظر آتا ہے جو بہ اعتبارِ تعدد و تجدد ایک شائستہ و تعلیم یافتہ ذہن کا پہلا اور سب سے زیادہ واضح سراغ دیتی ہیں۔ ایک شائستہ انسانی روح کا اولین امتیاز ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ وہ متعدد دلچسپیوں و تدریجات پر زندگی سے لطف اندوز ہو سکتی ہے۔ زندگی کی جو چیزیں اس کے لئے کوئی قیمت رکھتی ہیں ان کی حیثیت اس کے لئے محض انفرادی نہیں ہوتی بلکہ اس کو وہ ایک نظامِ عضوی کی طرح آپس میں مربوط نظر آتی ہیں۔ ایک قیمت دوسری قیمتوں کے ساتھ شعوری یا غیر شعوری علائقِ ذہنی کے ماتحت وابستہ ہوتی ہے۔ مثلاً حسن بجائے خود ایک قیمتی چیز ہے لیکن ایک شائستہ ذہن کے لئے اس کا تعلق زندگی کی کچھ اور قیمتوں کے ساتھ بھی یقیناً قائم ہوتا ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بھی کہہ دینا ضروری ہے کہ "طلسمِ زندگی" سے کسی مدعیانہ یا مخاصمت انگیز طریقِ فکر و عمل کی ترجمانی مقصود نہیں بلکہ مصنف نے اس کے ذریعے سے اپنی زندگی کے مشاہدات و تجربات اور افکار و محسوسات کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ٹیگور کے اندازِ بیان نے ہندوستان کی ادبیات میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ کیا جس کی اندھا دھند تقلید

اردو میں بیحد جوش وخروش سے کی گئی جن لوگوں کو ٹیگور کے ساتھ کوئی عقلی یا روحانی علاقہ نہ تھا انہوں نے بھی ٹیگور کی طرزِ خاص کو اڑانے کی کوشش کی جس کا نتیجہ نہایت دردناک اور قابلِ رحم رہا۔ "طلسمِ زندگی" ہی شاید اردو کی وہ تنہا کتاب ہے جس میں ٹیگور کے معنوی فیض سے کوئی قابلِ قدر نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کے دوران میں کئی جگہ ٹیگور کی رُوح کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف نے کہیں بھی ٹیگور کی نقل کرنے یا اس کا انداز اڑانے کی کوشش نہیں کی مصنف کو غالباً اس چیز کا نہ علم ہے نہ احساس کہ اس کے قلم سے ٹیگور کا بہترین اثر پہلی بار اُردو کے قالب میں ظاہر ہو رہا ہے۔ ایک فطری مناسبتِ ذوق اور روحانی اشتراک نے از خود اس سے نثر میں وہ نظمیں لکھوائی ہیں جن کی دوسری مثال ہمیں صرف ٹیگور میں ملتی ہے۔ دونوں کو امن و سکون اور حسن و کمال کی جستجو ہے اور دونوں کی آواز نغمہ ئینگ ہے بانگِ دہل نہیں۔

"طلسمِ زندگی" کے اوراق میں ہمیں جس زندگی کی تصویر نظر آتی ہے وہ ایک خاموش اور بڑی حد تک عزلت پسند شخص کی طبیعت کا انعکاس ہے۔ عملی زندگی کے ہنگامہ خیز معرکے اور شورشیں اس طوفان میں تقدیر کی بے پناہ دراز دستیاں اور اس تمام کشمکش کے ساتھ گناہ و ظلمت کی آمیزش ایسی چیزیں ہیں جن کے ساتھ مصنف کو خوش قسمتی سے شاید واسطہ نہیں پڑا۔ یہ سچ ہے کہ "طلسمِ زندگی" کا ایک پورا باب (جدوجہد) بڑے جوش، صداقت اور خلوص کے ساتھ عزم و ہمت کے مضامین کی شرح کرتا ہے لیکن ان جذبات کا مصدر دراصل مصنف کا مستحکم ایمان اور فطری رجائیت ہے نہ کہ عملی زندگی میں انہماک۔ وہ خود کہتا ہے کہ "کامل سکون زندگی کے لئے عین موت ہے" لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ زندگی کی جدوجہد کو اقبال کی طرح مقصود بالذات نہیں سمجھتا بلکہ اسے ایک اضافی قیمت دیتا ہے اس لئے کہ اسکے ذریعے سے انسان کی رسائی اُس محبوب منزل تک ہوتی ہے جہاں زندگی میں سکون قرینے اور حسن کی مستقل اور دائمی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ بحیثیتِ مجموعی مصنف کی طبیعت کا رُخ بجائے شور و غوغا کے امن و سکون کی طرف مائل ہے اور یہ خصوصیت اس کے عام شاعرانہ و متصوفانہ افتادِ طبیعت کے عین مطابق ہے۔

میاں بشیر احمد صاحب ولایت کے تعلیم یافتہ ہیں اور لاہور کے ایک ایسے روشن خیال خاندان کے فرد ہیں جس نے مغرب کے بہترین اثرات کو نہایت فراخ دلی اور بے تعصبی سے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ با ایں ہمہ میاں صاحب کی "صوفیانہ مشرقیت" "تہذیبِ حاضر کی گرم بازاری اور ہنگامہ خیزی کو تشویش کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ یہ (بقول خود) گورنمنٹ کالج لاہور کا پڑھا لکھا آکسفورڈ کا بی۔ اے۔ ایل والا، لندن کا نام نہاد بیرسٹر یورپ کا "تمدن یافتہ" اپنے سینے کے اندر وہی پُرانا مشرقی دل رکھتا ہے:۔

ہماری نئی ابھرتی ہوئی پود بے باکانہ لہلہاتی ہے اور میں گھبرا جاتا ہوں۔

خاموشی، نرمی، ضبط یہ اس میں نہیں، ہوا کے جھونکے آتے ہیں تو یہ پودے جھومتے ہیں اور اپنے جھومنے سے سارے چمن میں ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں۔

میں کہتا ہوں نونہالو دیکھو آرام سے، ہولے ہولے اپنا جھولا جھولو، دیکھو آرام سے کہ تمہیں اطمینان نصیب ہو!

وہ چلاتے ہیں، خاموش رہو تم اور اپنی نرمی کو سنبھال کر رکھو اپنے لئے، اور اپنی زندگی کو ضبط بنائے رہو، اور آرام تمہارا خدا دے تمہیں اور ہولے ہولے جلے تمہارا جھولا ....

میاں صاحب نے کتاب کے ہر حصے میں جابجا اپنی ہمہ گیر لطافتِ احساس کے ثبوت بہم پہنچائے ہیں۔ قدرت اور اس کے مناظر سے لے کر انسان کی اخلاقی و روحانی کیفیتوں تک کوئی ایسی چیز نہیں جس کو انہوں نے شدت سے محسوس نہ کیا ہو یا ہمدردی سے نہ سمجھا ہو۔ "تاریکی آہ" کے عنوان سے یہ چھوٹا سا دلکش قطعہ بجائے خود ایک نظم ہے:-

تاریکی آہ! ظالم تاریکی نے میرے کمزور دل پر قابو پالیا ہے۔ اے میرے خدا! تو اپنی سونی دنیا کے اندر کسی غم نصیب کو اس تاریک رات میں بیدار نہ کیجیو، اے میرے آقا نہ کیجیو!

روشن دنیا خوشیوں کا گھر ہے لیکن میری اندھیری کوٹھری میں تو صبح کے تارے کی چمک بھی نہیں جس سے میری غم زدہ روح کچھ تسلی پا سکے۔

ہائے اے میرے خدا! تو کسی غم نصیب کو اس اندھیری رات میں بیدار نہ کیجیو، اے میرے مالک نہ کیجیو!

کتاب کا پہلا مضمون "طلوعِ آفتاب" رات کی تاریکی اور پھر بتدریج پھیلتی ہوئی روشنی کی تصویر دکھا کر امید اور نور کی اس سنہری کرن پر ختم ہوتا ہے:-

راتوں کے سونے والو! جاگو! یہ صرف رات ختم نہیں ہوئی، یہ صرف دنوں میں ایک اور دن کا اضافہ نہیں ہوا، مردہ دلو! زندہ ہو جاؤ کہ ہر روز انسان کے لئے زندگی کے جشن کا دن ہے!

کیا ہر روز زمین آسمان کی روشنی سے منور نہیں ہو جاتی!

دیکھنے والو! دیکھو!

یہ اخلاقی میلان مصنف کی روح کا ایک حقیقی رُخ ہے کیونکہ قدرت اُس کے لئے ... بلکہ اس کے پردے میں وہ ایک ایسی زندگی سے دوچار ہوتا ہے جو تمام ایمان ... سا مضمون دیکھئے:-

خاموشی، تنہائی، ہر طرف کھلی ہوئی کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی وسعت

روح کے استغراق کے لئے ایک میدان، ایک فضا، ایک ساکن سمندر!

جی چاہتا ہے کہ تیز چلچلاتی دھوپ ہو اور یہی دشت عرب بن جائے کوسوں تک آبادی نہ ہو اور یہی صحرائے اعظم ہو جائے سورج ہو زمین ہو میں ہوں اور بس ——— پھر کائنات مجھ سے کتنی قریب ہو جاتی، پھر ان دیکھا وجود کیونکر میری دیکھتی آنکھوں میں جھلک اٹھے ——— پھر میں ہوں اور وہ!

مصنف کی صوفی منشی صرف قدرت ہی کی اداؤں کو نہیں سمجھتی بلکہ انسانی جذبات کے لئے بھی اس کا احساس اتنا ہی لطیف ہے:۔

بھکارن کو درشتی سے نہ دھتکار، بیکسی خدا کو پیاری ہے اور جو اسے محبوب ہیں تو انہیں نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھ!

اگر تیری فطرت صحیح احساس سے خالی ہے تو آنکھیں جھکائے اور اپنی سنگدلی پر آنسو بہا ....

ایک اور جگہ کہتا ہے:۔

کبھی کبھی جی میں آتا ہے کہ عشرت کی اس غلامانہ زندگی کو خیرباد کہہ کر اپنے آزاد رو بھائیوں کے زمرے میں جا ملوں، عسرت کا منہ دیکھوں اور قناعت سے پیار کروں، ....

لیکن عشرت کی محبت آہ! اس غلامی کی الفت پیچھا نہیں چھوڑتی کہ اپنے نفس سے رہائی ہو، وہ سو سو بہانے ڈھونڈتی ہے۔

مصنف کے یہ صوفیانہ خیالات اس کو اسی طرز خیال کے شارح کی حیثیت سے روشناس کراتے ہیں جس کی شاندار ترجمانی انگلستان میں ورڈزورتھ اور رسکن نے انیسویں صدی میں کی تھی۔ ورڈزورتھ اور رسکن کی طرح وہ بھی دور جدید کی صنعتی تہذیب سے بیزار ہے اور ایک چھوٹے پیمانے پر انہیں کی طرح اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے:۔

کس قدر معمولی باتوں میں ہماری زندگی گزرتی ہے کیسی معمولی باتوں کو ہم غیر معمولی سمجھتے ہیں۔ لباس، مکان، سواری، گفتگو، چال، یہ تمدن ہے، اوروں کی کہی ہوئی باتیں دہرانا، دور دراز کے واقعات سننا سنانا، ورق گردانی کرنا، ورق سیاہ کرنا، یہ تعلیم ہے اور ان پر ہمیں ناز ہے غرور ہے تکبر ہے۔ کوئی شخص ڈھیلا پاجامہ پہنے آرہا ہو تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی روح ناقص ہے، کسی کے مکان کی طرز تعمیر سیدھی سادھی ہو تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حسن تناسب سے آگاہ نہیں .... پھر کوئی فرز[illegible]ں کی لغات نہ بن چکا ہو، ہر فن میں تھوڑی سی دستگاہ نہ رکھتا ہو تو خواہ اس کی ذہانت و[illegible] ہمارے نزدیک جاہل مطلق نہ سہی پرانے زمانے کا ایک بوسیدہ آدمی قرار پاتا ہے [illegible]ات کی قدردان ہے اور اگر یہ وجہ ہے کہ آج کل ترقی بہت ترقی کر رہی ہے تو [illegible]ترقیوں پر یہ بے تابیاں کچھ ترقی کا نشان نہیں بلکہ تنزل کی علامات ہیں۔

اسی طرح ایک اور مقام پر کہا ہے۔

صرف بند محلوں میں بیٹھ کر ستار بانسری کا زر خرید گانا نہ سن بلکہ باہر کھلی ہواؤں میں قدرت کی دریا دلی کا نظارہ کر۔ دیکھ صبح ہوتی ہے تو چمن کی چڑیاں پہاڑ کی سبز گھاٹیوں میں اپنی راگنی چھیڑ دیتی ہیں خاموش جنگل کان دھر کر سنتے ہیں اور پہاڑوں کی دنیا اس شیریں گونج سے آباد ہو جاتی ہے۔ خوف ناک فلک چٹانوں کے بیچوں بیچ آبشار شور کرتا ہوا نیچے کے پتھروں پر گرتا ہے اور لاکھوں ننھی آوازیں مل جل کر ایک نہ تھمنے والے راگ میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

"طلسم زندگی" کا جواب "آئینۂ دل" کے نام سے موسوم ہے اس میں میاں صاحب نے جہاں بھی محبت کے مضمون پر قلم اٹھایا ہے پاکیزگی خلوص اور لطیف احساس کی تصویر کھینچ دی ہے۔ صوفی شعرا کی طرح یہاں محبت کا جذبہ وسیع ہوتا ہوا بار بار عشق حقیقت اور وحدت الوجود کے تصور سے جا ملتا ہے لیکن ساتھ ہی ایسے منثور قطعات کی بھی کمی نہیں جن میں ایک خالص انسانی وارضی گوارفع واطہر محبت کا اظہار ہے۔ مثلاً ذیل کے فقرات کا خطاب ظاہر ہے کہ کسی انسان ہی سے ہو سکتا ہے۔ الفاظ کے ترنم اور جذبات کے گداز نے انہیں ایک دلاویز نظم بنا دیا ہے:۔

دنیا کے گرد آلود کہکشاں نے میری اور تیری محبت کے تاروں کو مدت سے جدا کر رکھا ہے۔

ہم دور ہی دور ٹمٹماتے ہیں اے جان! ہم دور ہی دور آنسو بہاتے ہیں۔

تو مشرق میں تاروں کے ایک جھرمٹ سے الگ اور میں مغرب میں مہ زرد روسے کچھ دور پڑا ہوں۔

وہ ٹمٹماتے تارے اور یہ زرد سا کملایا ہوا چاند تیری آرزوے الفت اور میری تمنائے محبت کی پیاری آرام گاہیں ہیں ـــــ لیکن ہم خود تو دور ہی دور ٹمٹماتے ہیں۔ اے جان! دور ہی دور آنسو بہاتے ہیں ......

اسی طرح کی چند نظمیں یہ ہیں:۔

آ تجھ سے محبت کروں میں ایسی جیسی تجھے مجھی سے ملی اور مجھی سے ملے گی؛

آ مجھ سے محبت کر تو ایسی جیسی مجھے تجھی سے ملی اور تجھی سے ملے گی؛

اے معشوق میرے! آ اپنے سمندر کی خاموش گہرائی میں یہ زمین و آسماں تو فقط طوفان کا گھر ہیں اے پاک دل!

آتا ہے تیرا وفادار تیرے سامنے!

کس لئے وہ آتا ہے شیریں دوست!

تجھ سے ہم کنار ہونے کو!

تیری آنکھوں کو اپنے لبوں سے چھو لینے کو!

تیری آغوش میں اپنا سر رکھ دینے کو!

نہیں اے دوست! وہ آتا ہے کہ آکر تیرے پہلو میں خاموشی سے کھڑا ہو جائے آنکھیں جھکائے ہوئے!

میں اور تو ملتے ہیں، میں اور تو تنہا!

یہ نامہ و پیام کا وقت نہیں

یہ شعر و نظم کی ساعت نہیں

یہ بات چیت کی گھڑی نہیں میرے دوست!

اس زرّیں لمحے میں مَیں اور تو صرف ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیں!

دوست میرے! لے چل مجھے اپنی خلوت میں

لے چل مجھے اُن شاہی باغوں میں

لے چل مجھے اُس شہزادی کے گلشن میں

جہاں دوست میرے! مروت کا مسکن ہے،

جہاں دوست میرے! محبت کا گلشن ہے،

جہاں دوست میرے! وفا کے سدا بہار پھول کھلتے ہیں اور کھلتے ہی رہتے ہیں۔ وہاں دوست میرے!

دنیا کے کسی بھی ادب میں محبت کوئی نیا یا انوکھا مضمون نہیں۔ خود اُردو کا دامن شروع ہی سے عشقیہ افسانوں اور عشقیہ شاعری سے مالا مال رہا ہے۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے اس مضمون کے بیان میں خلوص، جوش، شدید جذبۂ رشک، امید و بیم، سوز و گداز، محبوب پر مرمٹنے کا ولولہ سب کچھ ہمیں دیا۔ لیکن ایک چیز "احترام" وہ ہمیں نہ دے سکے۔ شاید ان کے حالات کا تقاضا یہی تھا۔ یہ سچ ہے کہ غالب اور اقبال میں "محبوب بحیثیت خدا" کی عظمت و جلال کا اعتراف بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن "محبوب بحیثیت انسان" کا صحیح ادب و احترام ہمارے اپنے دور کے لئے مخصوص تھا اور پھر اس دَور میں بھی یہ چیز گنتی کے چند ادیبوں کا حصّہ ہے۔ ان چند ناموں میں میاں بشیر احمد کا نام یقیناً بہت ممتاز ہے۔ میاں صاحب نے محبت کے مضامین میں احترام ہی کو دخل نہیں دیا بلکہ محبوب کی ذات کو ایک بہت بڑی اخلاقی قوت

اور روحانی طہارت کے سرچشمے کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ یہ فرق عورت کے قدیم و جدید تصوّر کا فرق ہے۔ خود میاں صاحب کا تصور اس موضوع پر کیا ہے، وہ ذیل کے قطعے سے معلوم ہوگا جس میں جذبے کی معصومیت اور پاکیزگی ورڈزورتھ کی مشہور منظوماتِ "لوسی" کی یاد دلاتی ہے:۔

وہ دنیا کی محفلوں میں دور گمنام گوشوں میں بیٹھتی تھی۔ اس کے عزیز و اقربا اس کی نیک طینتی کے دلدادہ تھے اور اس کی قابلیت اپنے ہم جنسوں سے دوچار ہوتے بھی شرماتی تھی۔

پھر جب محبت اسے اپنے باغ میں لے گئی تو اس کی آواز پرندوں کے چہچہوں سے زیادہ شیریں اور اس کی نگاہیں نرگس پھولوں سے زیادہ دلفریب ہوگئیں۔ اس کی بات بات سے حسن و خوبی ٹپکنے لگی اور اس کے ایک ایک اشارے سے فطرت کی چھپی ہوئی قوتیں رونما ہوگئیں۔

محبت اس کے لئے ترقی کا زینہ ثابت ہوئی اور وہ اس پر چڑھتی ہوئی آسمانِ زندگی کا چمکتا ہوا تارا بن گئی!

محبت کے متعلق یہ طرزِ عمل مصنف کے اس عام اخلاقی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہے جس سے وہ زندگی کے ہر شعبے کو دیکھتا ہے۔ کتاب میں اسی قسم کے ٹکڑے جابجا بکھرے ہوئے ہیں جن سے ایک بے انتہا اخلاقی فطرت کا اظہار ہوتا ہے:۔

اے دنیا! تو مجھے بُرا کہہ لے، اے رواج! تو میری ہنسی اڑائے جا! لیکن اس سے یہ نہ ہوگا کہ میں غم و غصہ سے بھڑک اٹھوں، اس سے صرف یہی ہوگا کہ راتوں کو میرا دل بیقرار رہے گا کہ کسی طرح برائی کا جواب برائی سے نہ دوں کسی طرح محبت میں سب کی ایسی خدمت کروں کہ فطرت خدا کے آگے میرے لئے دست بدعا ہو جائے!

"سرگوشیاں" کے عنوان سے جو باب ہے اس میں مصنف کی شخصیت کا ایک اور نمایاں پہلو نظر آتا ہے یعنی ظرافت۔ یہ ظرافت نہ تو قہقہہ انگیز ہے اور نہ اس میں اُس تلخی کی جھلک ہے جو اسے ہجو بنا دے۔ البتہ کہیں کہیں ایک ہلکی سی تعریض نظر آتی ہے جو ناگوار نہیں ہوتی۔ مثلاً رشتہ داروں کے متعلق کہا ہے:۔

ہر شخص اپنے رشتہ داروں سے بیزار ہے اور دوسرے کے رشتے داروں سے مانوس یعنی رشتے داروں سے انسان کو ہمیشہ محبت ہوتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے رشتے دار نہ ہوں!

سچ یہ ہے کہ اپنے رشتے داروں سے اچھا برتاؤ کرنا حد درجہ دشوار ہے اور ان سے اچھے سلوک کی تمنا رکھنا تو قطعاً جہالت ہے۔ شکایت کرنے والے کہتے ہیں کہ ایک عزیز کو دوسرے عزیز کی خوبیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ اصل یہ ہے کہ پردے آنکھوں پر سے اٹھ جاتے ہیں اور اصلیت عیاں ہو جاتی ہے ....

ہم دوست کو دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں، ہمارا عزیز جانتا ہے کہ ہماری مسکراہٹ کتنی اصلی ہے کتنی نقلی۔ ہم دوست کے ساتھ وہ لغو
مرو کی باتیں کرتے ہیں جو بغیر ہمارے کہے ہمارے عزیز کے دل میں ہیں۔ ہمارا دوست چند دن کا وقفہ ڈال کر آتا ہے تو ہمارا چہرہ دیکھ
کر ہی بلا وجہ بشاش ہو جاتا ہے، عزیز بس دروازے سے نکلتا ہے اسے عین سامنے ہمارا ہی منحوس جلوہ نظر آتا ہے۔ ہماری صحت
کی خرابیاں، ہماری ہمت کی پستیاں، ہماری نیت کی خرابیاں، سب ہمارے عزیزوں پر عیاں ہیں اور اکثر ہمارے دوستوں سے نہاں...
دوست کو مزا ہے کہ کبھی کبھی آ کر سلام آداب کہہ دیتا ہے۔ بیچارے عزیزوں کا اللہ ہی والی ہے جنہیں کبھی خدا حافظ کہنے کا
موقع نہیں ملتا۔ دوست تو اگر ہمیں سجا سجایا دیکھ لیتا ہے۔ لیکن عزیز تو ہر روز منہ دھونے سے پہلے ہمارا منہ دیکھتے ہیں، پھر انہیں
کس طرح ہمارا حسن نظر آئے! . . . .

اسی ظرافت میں کہیں کہیں انسانی فطرت کے نفسیاتی پہلوؤں پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے:-

بڑے آدمیوں کی صحبت بُرے آدمیوں کی صحبت سے تو شاید اچھی ہے لیکن بہت کم موقعے ایسے ہوتے ہیں جب ہم کسی بڑے آدمی
کی صحبت سے مطمئن ہو کر اٹھیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بڑا آدمی مشغول ہوتا ہے، وہ بیچارہ ہم سے چند رسمی باتیں کر کے آدابِ مجلس کا خراج ادا
کرتا ہے، اس کی انسانیت انگڑائیوں میں اور ہمارا خلوص کشمکش و پیچ میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی وہ اپنا کوئی کارنامہ بیان کرتا ہے تو باوجود
انتہائی انکسار کے وہ بمشکل کامیاب ہوتا ہے کہ ہماری نظروں میں نہ گر جائے۔ کبھی وہ عام آدمیوں کی سی باتیں کرتا ہے تو ہم حیران ہوتے ہیں کہ کیا
اس کی بڑائی کا ظاہر نہ ہونا ہماری حماقت ہے یا فی الحقیقت بڑائی ہی ایک معمولی وصف ہے۔ کبھی وہ عمداً خاموش رہتا ہے اور ہمیں اس
زبردستی کی خاموشی میں کچھ نہیں سوجھتا کہ کیا کریں۔ غرض بڑے آدمی کی صحبت اک ناقابلِ برداشت آفت ہے۔

اسی طرح آہوں کے متعلق لکھتے ہیں:-

آہیں آہیں بھرنے والوں کی طرح قسم قسم کی ہوتی ہیں، لیکن یہاں صرف چند عام فہم آہوں کا ذکر مقصود ہے۔
مذہبی آہیں عموماً عادتاً بھری جاتی ہیں لیکن بعض اوقات وہ خدا اور اس کے بندوں کے ذریعے سے اثر ڈالنے کے لئے بروئے عمل لائی جاتی ہیں
حسینوں کی آہیں حسن پرور ہیں اور صحت آور۔ بعض نازک مزاج لڑکیاں علاماتِ وقف کا کام چھوٹی چھوٹی آہوں سے لیتی ہیں۔
آہوں کا ایک بڑا فایدہ یہ ہے کہ اس سے پھیپھڑے اچھی طرح پھیلتے ہیں اور اگر دل پر بُرا اثر پڑے بھی تو جسم نشو و نما پاتا ہے۔
اسی لئے سوائے سرورؔ کے ہمارے باقی شعرا کو ان سے کچھ نقصان نہ پہنچا۔ میں اک سمجھدار شخص کو جانتا ہوں کہ جب اسے کوئی کام نہ ہو تو
باغ کی تازہ ہوا میں جا کر علی الصباح لمبی لمبی آہیں بھرتا ہے۔

سرورؔ کی شاعری میں لفظ "آہ" کا استعمال جس کثرت و تواتر سے ہوا ہے اس کی طرف کس نفاست سے اشارہ کیا ہے،
کاش اُردو میں ایسی پاکیزہ ظرافت نگاری کی مثالیں اس سے زیادہ ہوتیں۔

ایک جگہ میاں صاحب نے محبت کی قسمیں گنائی ہیں۔ ایک تو خیر ماں بچے والی محبت ہے جو محبت کی بسم اللہ و سبحان اللہ ہے لیکن اس کے بعد ایک اور محبت آتی ہے :۔

میاں بیوی والی محبت کہ محبت کی قل ہو اللہ و نعوذ باللہ ہے۔ اس کی پھر بہت سی قسمیں ہیں، ایک پرانی جس میں جناب شوہر لٹھ مار کر بیوی سے محبت کراتے ہیں، دوسری نئی جس میں جناب زوجہ کم از کم شوہر سے محبت نہیں کرتیں، تیسری وہ جس میں بات بات پر طلاق ہوتی ہے، چوتھی وہ جس میں ازل سے ابد تک اور جنت سے جہنم تک میاں بیوی کبھی کہیں ایک دوسرے کا دامن نہیں چھوڑتے یہاں تک کہ خدا تنگ آ کر ان کی روحوں کو برباد کر دیتا ہے۔

ظریف کا کمال یہ ہے کہ خود اس کی اپنی ذات بھی اس کی ظرافت کی زد سے پناہ میں نہ رہے۔ اس چیز کی بھی "طلسم زندگی" میں کمی نہیں۔ "ملاقاتی" کے عنوان سے جو مضمون ہے اس میں غالباً مصنف نے اپنی ہی ذات کو مشق ظرافت بنایا ہے۔ "امارت کا تحفہ" اور بعض دوسرے مضامین بھی اسی لحاظ سے بیحد دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان چیزوں میں کہیں کہیں مصنف کی خانگی زندگی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً لڈو بھی اسی قسم کا ایک لذیذ مضمون ہے۔ البتہ اس مضمون کے ابتدائی جملے کی ترکیب لفظی پر راقم الحروف کو اعتراض ہے :۔

"للہ اپنے ارادے سے باز آیئے" میں نے نانی اماں سے کہا۔

یہ انگریزی طرز بیان ہے۔ اردو میں غیر موزون اور مانوس معلوم ہوتا ہے۔ اس فروگذاشت سے قطع نظر کیا جائے تو جا بجا مصنف کی قدرت کلام اور جائز و پُر زور جدت بیان کی مثالیں ملیں گی۔ مثلاً۔ امیر آدمی اور اس کے نوکروں کی مڈبھیڑ کا کیا اچھا نقشہ کھینچا ہے :۔

اگر کبھی میں اکیلے دیکھ کے مسکراتا ہوں اور وہ اتفاقاً ادھر آ نکلتے ہیں تو انہیں دیکھتے ہی اپنے تبسم کو سمیٹ لیتا ہوں۔

دو نام نہاد دوستوں کی ملاقات کا ذکر :۔

(وہ دوست) دور ہی سے دیکھ کر بعض دفعہ مڑ جانا چاہتا ہے لیکن اک ملزم کی طرح اس کے دل میں کھٹک جاتی ہے کہ ضرور ہم اسے دیکھ چکے ہیں مجبوراً ہمارے پاس سے ہو کر گزرتا ہے اور اک پھیکی مسکراہٹ ہماری نذر کرتا ہے۔

زمانۂ حال کی صنعتی تہذیب اور اس کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے "فی الحال" کا استعمال کیسے بلیغ پیرائے میں کیا ہے :۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر ہمیں خدا کی ہستی کا یقین ہو تا جو نہیں ہے تو اپنی موجودہ روش کے ساتھ شاید ہم اس کے ہم پلہ ہونے کا دعویٰ کرتے۔ فی الحال ہم کو اس پر غصہ آتا ہے کہ اگر کسی کا خدا ہے تو وہ ہماری طرح شاہراہِ ترقی پہ کیوں گامزن نہیں ہوتا؟

لیکن بلاغت معنوی کی بہترین مثالیں غالباً وہ مقولات ہیں جو "خیالات پریشاں" کے باب میں لکھے گئے ہیں

تاریخِ فلسفہ کے متعلم کے لئے ذیل کا جملہ خاص معنی رکھتا ہے:۔

کائنات کا معما کبھی حل نہیں ہو سکتا، حل ہوتے ہوتے وہ اپنی صورت بدل لیتا ہے۔

یہ باب اسی قسم کے پُرمغز اقوال سے بھرا ہوا ہے جن میں سے صرف چند مثالیں یہاں دی جاتی ہیں:۔

لوگ سڑک پر گذرے جاتے ہیں، کیا اسی کا نام دنیا ہے؟

زندگی اصول کی آنکھوں میں خاک ڈالتی ہے۔

کچھ میں ایسا بُرا نہیں بلکہ دوسروں کی برائی مجھے نیک راہ سے بھٹکاتی رہتی ہے۔

دنیا ہماری باہمی دشمنی سے پُررونق رہتی ہے۔

غرض پڑھنے والے کے لئے اس کتاب میں علمی وادبی اور اخلاقی و فلسفیانہ نکات کے بہت سے جواہر ریزے موجود ہیں جن کی ایک جھلک اس مضمون میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کی ظاہری خوبیوں کی طرف مجملاً پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ طباعت وکتابت خوب صورت تصاویر اور دوسرے آرائشی محاسن کے لحاظ سے اردو میں شاید ہی کوئی کتاب اس سے پہلے اس اہتمام اور سلیقے سے شائع ہوئی ہو۔ اگرچہ کسی کتاب کی معنوی خوبیاں ہی اس کی اصل خوبیاں ہوتی ہیں لیکن ہماری آرزو ہے کہ اردو کے مصنف اور ناشر "طلسمِ زندگی" کے حسنِ صوری سے بھی کوئی مفید سبق سیکھیں ✦

حمید احمد خاں

گھٹا

اٹھی ہے جھوم کر گھٹا سُرور سے لئے ہوئے سرودِ بیخودی کی دلنوازیے لئے ہوئے
جوان ہو گیا ہے جس سے دل وہ شے لئے ہوئے

گھٹا نہیں سمندروں کی کوئی مست لہر ہے گھٹا نہیں کوئی سپہر گرد موجِ بحر ہے
گھٹا نہیں جنوں فروش مستیوں کی نہر ہے

بہار کی پری کا حُسنِ دلنواز ہے گھٹا ہے نگارِ دلفریب کی ادائے ناز ہے گھٹا
طلسم ساز ہے گھٹا فسوں طراز ہے گھٹا

گھٹا نہیں مجسمہ ہے بیخودی کے رنگ کا گھٹا نہیں سرود ہے شباب کی امنگ کا
گھٹا نہیں پیام ہے نشاط کی ترنگ کا

یہی گھٹا مگر دکھے دلوں میں غم کی آگ ہے فغاں نصیب کشتوں کا جاں گداز راگ ہے
گھٹا نہیں غمِ فراق کا سیاہ ناگ ہے

عادم

ترانۂ مسرّت

محبّت کا خزانہ مل گیا ہے
مسرت کا بہانہ مل گیا ہے

مرے ہاتھ آگیا وہ یگانہ
مجھے سارا زمانہ مل گیا ہے

تجھے اے طائرِ دل ہو مبارک
سرِ عرش آشیانہ مل گیا ہے

ترے رستے میں ہم نے جان دیدی
زمانے کو فسانہ مل گیا ہے

یہ دل ڈوبا ہوا تھا بحرِ غم میں
زہے قسمت کرانہ مل گیا ہے

تری توصیف میں گاتے ہیں بلبل
گلوں کا اک بہانہ مل گیا ہے

دلِ شکستہ میں دیکھیں گے تجھ کو
ہمیں آئینہ خانہ مل گیا ہے

نہ اُٹھے گا کبھی سجدے سے اب سر
کسی کا آستانہ مل گیا ہے

ح۔ ب

تبادلہ

ایک بہت بڑی راجدھانی تھی۔ شہر کے ٹھیک وسط میں ایک تالاب تھا۔ اس کا پانی نہایت صاف و شفاف تھا۔ اور اس میں کنول کے ہزاروں پھول کھلے ہوئے تھے۔ تالاب کے کنارے ایک آراستہ و پیراستہ خوبصورت باغ تھا، جس کو دیکھ کر بیساختہ منہ سے نکل جاتا تھا ؎

اگر فردوس بر روئے زمین ست ہمین ست وہمین ست وہمین ست

کہیں سرسبز درختوں کی دلفریب جھاڑی تھی۔ کہیں پھیلی ہوئی بیلوں سے شامیانہ سا بن گیا تھا۔ اس کے سائے میں سنہری گملے زیب دے رہے تھے، جن میں انواع واقسام کے پھول اور پودے لہلہا رہے تھے۔ بیلوں کے شامیانے میں جابجا محراب دار دروازے بنے ہوئے تھے اور ان پر بھی پھولدار بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ باغ کی روشیں کہیں تنگ تھیں اور کہیں چوڑی، تنگ روشوں پر ہری ہری گھاس لگی ہوئی تھی۔ اور چوڑا راستہ سنگِ مرمر کا تھا۔ تنگ روشوں کے دونوں جانب چمپا کے پودے تھے اور چوڑے راستوں کے دونوں طرف مولسری کے درخت، جابجا مصنوعی پہاڑ تھے! اور ان پر مصنوعی آبشاریں تھیں۔ کبھی مولسری اور کدمب کے درختوں پر چڑیوں کا دلکش نغمہ سنائی دیتا تھا تو کبھی پھولوں پر بھونروں کی گونج، کبھی ہوا کے جھونکوں سے تالاب میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں کا منظر زیب ارتعاش دکھائی دیتا تو کبھی جھاڑیوں میں نوشگفتہ کلیوں کی شرمیلی لرزش دل کو لبھاتی۔

(۲)

باغ میں کدمب کی جھاڑی سے علیحدہ مولسری کے درختوں کے سائے میں ایک صاف ستھرا جھونپڑا تھا۔ جھونپڑے میں ایک نوجوان مرد رہتا تھا۔ اور ایک نوجوان عورت۔ وُہی اس باغ کے مالی مالن تھے۔ باغ کے جو پودے خشک ہوجاتے یا پھول چٹکتے، اُن کو مالی علیحدہ کر کے اُن کی جگہ دوسرا پودا نصب کر دیتا۔ سوکھی ڈالیوں کو چھانٹ کر دُور کر دیتا اور گرے ہوئے پتوں کو جھاڑ کر باہر پھینک دیتا۔ اس طرح وہ نہایت محنت وتوجہ سے باغ کی داشت و پرداخت کرتا۔

مالن روزانہ صبح وشام پودوں کی جڑوں میں پانی دیتی، پیاسے پودے اُس کے پانی کے انتظار میں خاموش کھڑے رہتے۔ پودے اور بیلیں مالن کے محبت آمیز پانی سے بہت جلد جلد بڑھتیں۔ کوئی پودا یا بیل خشک ہوجاتی تو اُسے دیکھ کر

مالن کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ ایک شاخ میں دو کلیاں ہوتیں، ایک کرم خوردہ اور دوسری سلامت تو کرم خوردہ کلی کو توڑ کر پھینکتے ہوئے مالن تڑپ اُٹھتی۔ کسی روز تو پژمردہ پھول اور کرم خوردہ کلیوں کو دیکھ کر بے اختیار اُسکی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے +

(۳)

مالی اپنی چاہیتی بیوی کے ساتھ ڈھیر کے ڈھیر پھول توڑتا۔ مالی اپنی ڈالی بھر لیتا اور مالن اپنا آنچل، مگر باغ کے پھول ختم نہ ہوتے۔ دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر ہار، تاج، توڑا اور بہت سی چیزیں بناتے۔ دونوں اپنی ساری ہنرمندی صرف کر دیتے، اپنے شگفتہ دلوں کی تمام تازگی اِنہیں چیزوں میں منتقل کر دیتے +

مالی اور مالن سونے کی تھالیوں میں ایک کے بعد دوسری چیز سجا کر رکھتے۔ ہار، تاج، توڑا اور ہر قسم کے تھوڑے تھوڑے منتخب پھول۔ اس طرح سجی ہوئی سونے کی تھالیوں کو لیکر دونوں صبح و شام راج محل میں جاکر رانی کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ جیسے مندر کے دروازے پر دیوی کے سامنے پجاری اور پجارن ڈالی لئے کھڑے ہوں۔ رانی خوش ہو کر اُنکے تحفوں کو قبول کرتی۔ ہاروں کی ساخت سے خوش ہو کر اُس نے کتنی ہی اشرفیاں اُنہیں انعام دی تھیں +

(۴)

راجہ اور رانی میں بے انتہا محبت تھی۔ رانی پھولوں سے بے حد شوق رکھتی تھی۔ رانی کو سب سے زیادہ مسرت اُس وقت ہوتی جب وہ اپنے ہاتھوں سے راجہ کے گلے میں ان ہاروں کو پہناتی۔ راجہ بھی مسکراتا ہوا یہ کہکر رانی کے گلے میں ایک ہار ڈال دیتا۔ کہ "ہماری تمہاری مالا کے لین دین کا یہ مشغلہ کبھی ختم نہ ہوگا" دونوں جذبات سے بیخود نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے۔ بعض اوقات رانی راجہ کے سر پر پھولوں کا تاج رکھ کر دلفریب تبسم کے ساتھ کہتی کہ "آج آپ راجہ ہو گئے"۔ راجہ بھی اسی طرح مسکراتا ہوا پوچھتا کہ "آخر کس قصور میں مجھ کو معزول کیا گیا تھا"؟

ایک روز رانی نے اپنے ہاتھ سے ہار گوندھ کر نذرِ محبت کے طور پر راجہ کے قدموں میں ڈال دیا۔ راجہ نے اُسے بڑی قدر سے اُٹھالیا۔ اور اپنے ہاتھ سے اپنے گلے میں ڈالتے ہوئے بولا "اسکی جگہ پاؤں میں ہے؟ تمہارا گوندھا ہوا ہار میرے گلے کی زیب ہوگا"۔ بعض اوقات راج محل کی آراستہ خوابگاہ میں نرم اور صاف بستر پر رانی اپنے ہاتھ سے خوشبودار پھول بچھاتی۔ ملائم تکیے کے اُوپر بجا بجا پھولوں کی مالائیں سجا کر رکھتی۔ ایک روز رانی نے پلنگ کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "آج اس خلوتگاہ میں راجہ رانی کی شبِ عروسی ہے"۔ راجہ نے مسکراتے ہوئے کہا "تو ہیں کیا؟ پھول کے ساتھ پھول کی رانی کی شبِ عروسی ہوگی"۔ یہ کہہ کر راجہ ٹکٹکی باندھ کر رانی کی طرف دیکھنے لگا +

رانی گوشۂ چشم سے راجہ کی طرف دیکھتی ہوئی شیریں ہنسی کو تبسم میں منتقل کر کے بولی۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر

پھول میرا پانی پینے کے لئے بیتاب ہوتا تو "میں سوئمبر" میں پھول ہی کو "جے مالا" پہناتی "۔
راجہ نے کہا۔ "تو میں تمہارے ہی باغ کا مالی ہوتا۔ اور روزانہ ہار لیکر اپنی مالن کے ساتھ تمہارے پاس آتا"۔

(۵)

کبھی کبھی رانی مالن کو سامنے بٹھا کر اپنی فرمائش کے مطابق مالا گندھواتی۔ مالن اپنی تیزی سے چلتی ہوئی نازک انگلیوں کے درمیان ایک کے بعد دوسرے پھول کو پلک جھپکنے کے ساتھ رنگین سُوت میں پروتی چلی جاتی۔ جیسے ہرسنگھار کے پھول ہری ہری پتیوں کے درمیان سے ہو کر زمین کے آنچل میں جھڑ جھڑ گر رہے ہوں۔ رانی حیرت و محبت کے ساتھ مالن کے چہرے کو دیکھتی رہتی۔ یہ منظر رانی کو عالم خیال میں پہنچا دیتا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا۔ کہ شام کی دیوی اونچی دنیا میں اُڑتے ہوئے بادلوں کے درمیان نیلگوں آسمان کے آنچل میں تاروں کو پرو رہی ہے +

اسی طرح راجہ رانی پھولوں کے طرح طرح کے کھیل کھیلا کرتے۔ مالی اور مالن کو ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے کرشن اور رادھا کے ساتھ بہار کر رہے ہیں +

راجہ رانی کے اس مشغلے میں یہ دونوں جو حصّہ لیتے اس کے تصور سے ان کے نوجوان دل جوش و ولولہ سے لبریز ہو جاتے۔ پھولوں کی کھیتی کرنا، پھول چُننا، مالا گوندھنا، ان سب کاموں کو یہ دونوں حاصلِ زندگی سمجھتے +

(۶)

درختوں کی شاخوں کے گھنے پتوں میں چڑیاں گھونسلے بناتی ہیں۔ منقار بوسی کے وقت چڑیوں کا جوڑا "چیں چیں" کی مسلسل آواز سے اظہار محبت کرتا ہے۔ تو اپنی سُریلی آواز سے روشِ چمن کو معمور کر دیتا ہے۔ مالی اور مالن بھی چڑیوں کے جوڑے کی طرح مولسری کے درخت کے نیچے ایک تنہا جھونپڑی میں رہتے تھے۔ وہ پھول گوندھتے ہوئے گنگناتے بھی جاتے تھے۔ دونوں کی ملی جلی آواز سے جھونپڑی گونج اُٹھتی تھی۔ کبھی کبھی مالی فرطِ شوق سے اپنے ہاتھ کا گندھا ہوا ہار مالن کے گلے میں ڈال دیتا۔ اس کے بدلے میں مالن اپنے ہاتھ کی گندھی ہوئی مالا مالی کو پہنا دیتی +

(۷)

اس طرح لوگوں کی نظر بچا کر، تنہائی میں، جھونپڑی کے اندر، ایک گوشے میں ان کے ہاروں کا لین دین ہوتا۔ اس لئے مدت تک کسی کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ ایک روز نہ جانے کیا ایسی بے احتیاطی ہوئی کہ کسی نے دیکھ لیا۔ شاید اس کو مالی مالن کی حالت پر رشک ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ خبر راجہ کے دیوان کو ہو گئی کہ "مالی راجہ کی امانت میں خیانت کرتا ہے۔ اور باغ کے پھول چُراتا ہے"۔ بس غضب ہی تو ہو گیا۔ جو مالا راجہ رانی کے گلوں کی زینت ہو۔ وہی مالی مالن کے گلوں میں! اس

سے زیادہ سنگین جرم اور اس سے بڑا قصور اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ بات دربار میں چنگاری کی طرح دیوان کے منہ سے ظاہر ہوئی۔ تمام درباری غصّے سے آگ بگولہ ہو گئے۔ راجہ کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچی۔

(۸)

مالی گرفتار کر کے داخلِ حوالات کر دیا گیا۔ آج اس کے فیصلے کا دن ہے۔ دربار میں ہاتھ جوڑے مالی کھڑا ہے اُس کے ہاتھ پاؤں میں ہتکڑی اور بیڑی پڑی ہے۔ دربار میں لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ ابھی تک راجہ دربار میں نہیں آیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مالی نے جو قصور کیا ہے وہ ناقابلِ عفو ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مالی کا پھانسی پانا یقینی ہے کوئی کہتا ہے اس کی گردن ماردی جائے گی۔ غرض ہر شخص مالی کے نوشتۂ تقدیر کے ظاہر کرنے میں مصروف ہے۔

(۹)

راجہ کے محل میں رانی کے پیروں کے پاس بکھرے ہوئے خشک پھولوں کی مالائیں پڑی ہوئی تھیں جیسے غریب خاندان کے نحیف و زار بھوکے بچے ماں کی گود سے جُدا ہو کر دھول میں لوٹ رہے ہیں اور کوئی اُن کا پُرسانِ حال نہیں۔ مالن رانی کے قدموں پر گری ہوئی تھی۔ مالن کے آنسوؤں سے رانی کے دونوں پاؤں تر ہو گئے تھے۔ پیروں کا مہاور آنسوؤں سے دُھل گیا تھا۔ رانی فرطِ ہمدردی سے بیتاب ہو ہو کر اس سے دریافتِ حال کرتی، لیکن مالن کے منہ سے آواز نہ نکلتی۔ اس کا جگر تو چاک ہو رہا تھا لیکن اس کا منہ نہیں کھلتا تھا۔ باندیوں کو تمام باتیں معلوم تھیں۔ راجہ کے باغ سے پھول لے کر چوری چوری ہار بنانا، مالی اور مالن کا آپس میں ہار کا لین دین کرنا، غرض سب کچھ اُنہوں نے رانی سے بیان کر دیا۔ باندیوں سے رانی کو یہ بھی معلوم ہو گیا۔ کہ دربار میں مالی کا معاملہ درپیش ہے۔ تمام درباری جمع ہو گئے ہیں۔ صرف راجہ کے آنے کا انتظار ہے۔ مالن ڈبڈبائی ہوئی مایوس نگاہوں سے کبھی رانی کے منہ کو تکتی، کبھی باندیوں کے چہروں کو۔ باندیوں کی باتوں میں ہمدردی بھری ہوئی تھی۔

مالن کے آنسوؤں کی رَو کچھ دھیمی ہوئی۔ رات دن روتے روتے اس کی آنکھیں ورم کر آئی تھیں۔ آیندہ پیش آنے والے حادثے کے اندیشے سے اُس کا چہرہ خشک ہو گیا تھا، بال پریشان تھے۔ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں گڑگڑا کر التجا کی۔ جس کا ماحصل یہ تھا کہ ہم آپ کے لونڈی غلام ہیں۔ آپ ہمارے واسطے دیوی دیوتا ہیں۔ دیوتا کی پوجا میں جن پھولوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اُنہیں بیکار پھولوں کی مالا بنا کر ایک روز میں نے مالی کے گلے میں ڈال دی۔ اسی روز سے کبھی کبھی سوکھے ہوئے باسی پھولوں کی مالا گوندھ کر ہم آپس میں مالاؤں کی لین دین کر لیا کرتے تھے۔ سارا قصور میرا ہی ہے۔ مجھی کو سزا ملنی چاہئے۔

رانی نے توجہ کے ساتھ ساری باتیں سُنیں۔ کچھ دیر تک سناٹا رہا۔ اس کے بعد رانی نے پوچھا "تم نے ایسا کیوں کیا؟" رانی کی آواز میں مذاق آمیز استعجاب تھا۔ مالن نے کہا "آپ ماں ہیں۔ میں آپ سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتی۔ نہ جانے کیوں دل چاہتا تھا۔ اسی لئے میں نے ایسا کیا ماں!"

مالن کی آواز میں درد بھرا ہوا تھا۔ ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ رانی نے کہا "جلاد پہلے تیرا ہی سر اُتارے گا"

مالن نے اطمینان کا ایک ہلکا سا سانس لیتے ہوئے کہا "ایسا ہی ہونا چاہیئے ماں! مالی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور تو میرا ہے۔ میری مانگ کا سہاگ سیندور نہ دھویا جائے ماں!"

(۱۰)

رانی کا پیامبر دربار میں پہنچا۔ دیوان نے رانی کا پیام سناتے ہوئے کہا۔ اس معاملے کا فیصلہ خود رانی صاحبہ فرمائیں گی۔ دربار برخاست ہوگیا۔

ہتکڑی بیڑی پہنے ہوئے مالی ہتھیار بند سپاہیوں کے حلقے میں راج محل میں رانی کے سامنے حاضر کیا گیا۔ رانی کے حکم سے ہتکڑی بیڑی الگ کر دی گئی۔ رانی نے مالی اور مالن سے کہا۔ کہ شام کے بعد تمہارا فیصلہ اسی محل میں کیا جائے گا۔ اب تم لوٹ کر اپنی جھونپڑی میں جاسکتے ہو۔ لیکن کسی سے کوئی بات چیت نہیں کرسکتے۔ محافظوں کو اس بات کی نگرانی کی سخت تاکید کر دی گئی۔

مالی اور مالن کے جانے سے پہلے باندی نے مالن کے کان کے پاس جاکر آہستہ آہستہ رانی کی کوئی خاص ہدایت سنائی۔ جسے مالی کو نہیں سننے دیا۔ اسی طرح اُس نے مالی کے کان میں بھی کچھ کہا۔ جسے مالن نہ سن سکی۔ شام کا وقت گزر گیا۔ راج محل میں رانی کے سامنے مالی اور مالن ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوئے۔ مالن نے رانی کے قدموں پر سر رکھ کر پرنام کیا۔ اور رانی کے قدموں پر مالا چڑھا کر بولی "ماں مجھے سب پھولوں سے زیادہ ہرسنگھار کے پھول پسند ہیں۔ اس لئے آپ کے حکم کے مطابق ہرسنگھار کی مالا گوندھ کر لائی ہوں"

مالی کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ آواز میں لرزش تھی۔ مالی نے رانی کے قدموں پر بیلے کی ایک مالا چڑھا کر گلوگیر آواز میں عرض کی "ماں! میں سب سے زیادہ بیلے کا پھول پسند کرتا ہوں۔ اس لئے آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے اسی کا ہار گوندھا ہے"

رانی نے دونوں ہاروں کو اُٹھالیا اور جس کا جو ہار تھا اُسے اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے پوچھا "یہ

مالائیں راج باغ سے بنائی گئی ہیں نا ؟"

باری باری دونوں نے عاجزانہ لہجے میں کہا " یہی تو آپ کا حکم تھا ماں !"

رانی نے پوچھا " اس باغ کے پھول تمہارے ہوتے تو تم ان ہاروں کو کیا کرتے ؟" ان دونوں کے سکوت پر رانی نے کہا " اگر سچ بولو گے ۔ تو سزا کم کر دی جائے گی ۔ جان بخش دی جائے گی ۔ مالی اور مالن پر کچھ دیر تک سکوت طاری رہا ۔ آنکھیں کھلی تھیں ۔ پلک نہ جھپک سکتی تھی ۔ معلوم ہوتا تھا دونوں پتھر کا مجسمہ ہیں ۔ بالآخر مالن نے مالی کی طرف دیکھ کر کہا " میں یہ مالا ان کے گلے میں پہنا دیتی ۔"

ہونٹوں پر آتی ہوئی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے رانی نے بیتابی کے ساتھ مالی کی طرف دیکھا ۔ مالی نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے رانی کی جانب دیکھا ۔ پھر مالن کی طرف اشارہ کر کے کہا " اِس کے گلے میں ڈال دیتا "

رانی نے ہنستے ہوئے حکم دیا " تم دونوں جو چاہتے ہو وہی کرو "

رانی کی اس عجیب سزا دہی کی تعمیل میں خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے مالی اور مالن نے پھر آپس میں مالے کا تبادلہ کیا ۔

(دیپکے کلکتہ سے ترجمہ)　　**حافظ رام نگری**

لمحاتِ یاس

مَیں نے مانا کہ عیش ملتا ہے
زندگی کی گداز باہوں میں
ایسے لمحوں کو کیا کروں اختر
جب یہ دُنیا مری نگاہوں میں
گلشنِ بے بہار ہوتی ہے
ایک اُجڑا دیار ہوتی ہے

اختر انصاری

غزل

دنیا کی اب حالت یہ ہے دنیا کے یہ نقشے ہیں
اپنا جنکو کہتے ہیں ہم دشمن اُن سے اچھے ہیں

میرے حال پہ ہنسنے والو! انکو مستقبل کی خبر
مجبوروں پہ ہنسنے والے اکثر روتے دیکھے ہیں

آپ کو میرے صحرا کے کانٹوں پر بستر کا کیا درد
آپ تو پھولوں کے دامن میں نکہت بنکر سوتے ہیں

دل کے گم ہونے کا مجھکو رنج نہیں افسوس نہیں
جو کھوتے ہیں وہ پاتے ہیں وہ پاتے ہیں جو کھوتے ہیں

میرے تصور کی کوتاہی بھی ہے کتنی لطف فزا
اکثر کھایا ہے یہ دھوکا پہلو میں وہ بیٹھے ہیں

مجھکو الفت ان سے ہے اور انکو غیر کی چاہت ہے
اُلٹے بانس بریلی لانا شاد اسی کو کہتے ہیں

(۲)

اُدھر ہلاتے ہیں رومال لوگ ساحل کے
ادھر جو اس کنارے سے آ لگے دل کے

بڑھا رہا ہوں یہ کہہ کے تاب و طاقت دل
بجھا دیئے ہیں ہوا نے چراغ منزل کے

ادا نگاہ تبسم غرور عشوہ و حسن
یہ جتنے دشمن جان ہیں عزیز ہیں دل کے

خبر ہے میری طرف مڑ کے دیکھنے والے
وہ لوگ اٹھنے لگے بزم سے مقابل کے

فروغ حسن کی ممنون ہے نمود عشق
ہزار چاہنے والے ہیں شمع محفل کے

ترے شباب نے بیخود بنا دیا مجھ کو
تری نگاہ نے ٹکڑے اڑا دیئے دل کے

ابھی تو ٹھوکریں باقی ہیں راہ عشق کی شاد
ابھی تو اور کرشمے ہیں سعی باطل کے

شاد عارفی

دُنیائے ادب

طنزیات و مضحکات

فسانۂ طنزیات - ہماری آپ کی جان سے دُور، قرونِ اولیٰ میں یونانیوں کے دو مقتدر دیوتا تھے۔ الہتہ الفلاحت اور الہتہ الخمر اور حقیقت یہ ہے۔ کہ اس دور کی خصوصیات اور میلانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اِن دو دیوتاؤں کے علاوہ ذہنِ انسانی میں کسی اَور کی گنجائش بھی نہ تھی۔ انسان واہمہ پرست اور خلقتہً کمزور واقع ہوا ہے۔ اِس لئے کسی طاقتور دیا مافوق العادت، ہستی کا سہارا ڈھونڈھنا اس کی فطرت ہے، ہر وحشی یا نیم وحشی انسان، جس کو اپنی ضرورت کا احساس تھا اپنے فکر اور عمل کے اعتبار سے مذہبی یا توہم پرست تھا اور اب بھی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی انتہائی تہذیب اور ترقی کے باوجود آج بھی توہم پرست ہے، وہ صرف مخلوقِ خداوند کا معتقد ہے۔

انسان کے عہدِ اولین میں یقیناً ایسے مواقع بھی آتے ہونگے جب اُس کو ہر قسم کی عافیت اور کامرانی نصیب ہوتی ہوگی، مثلاً غلہ پکنے کا وقت، خرمن جمع کرنے کا موقع، موسم کا اعتدال، فضا کی دلکشی، صحت یا خوشگواری وغیرہ ان مواقع پر اُس کی مسرت اور نشاط میں ایک طرح کا ہیجان ہوتا ہوگا اور وہ معمول سے زیادہ اس کا اظہار کرتا ہوگا۔ ظاہر ہے یہی مواقع رفتہ رفتہ عید الجماعت میں منتقل ہوتے ہونگے۔

ہر عید اور تیوہار اپنے وجود کے اعتبار سے دو پہلو رکھتا ہے، ایک مذہبی، دوسرا تفریحی۔ کسی تیوہار کی مثال لے لیجئے اُس کی تاریخ اس حقیقت کی ترجمان ہوگی، دن کا کچھ حصہ عبادت یا نذر نیاز میں اور بقیہ سیر و تفریح، ملنے جلنے، دید و باز دید میں صرف ہوتا ہے۔ اِن حالات کے ماتحت آپ اہلِ یونان کی ابتدائی زندگی کا جائزہ لیں، اُن کے دو مخصوص اور محبوب دیوتا اللتہ الفلاحت اور الہتہ الخمر تھے، جن کے نام پر نذریں اور قربانیاں تہدیہ کی جاتی تھیں اِس نذر نیاز کا بیشتر حصہ غلہ اور شراب ہوتا تھا۔ یہ مراسم ختم ہو لیتے تو رنگ رلیوں کا دَور آتا جس میں عورت، مرد، بچے، بوڑھے، جوان، سب ہی شریک ہوتے ہنسی، دل لگی، مذاق، تمسخر، پھکڑ، طعن و طنز، سب و شتم، برہنگی و بے راہ روی، سب ہی کچھ ہوتا، جن کو آج آپ آرٹ اور آزادی سے بھی موسوم کر سکتے ہیں اور بربریت اور بے حیائی سے بھی۔ فرق صرف زمان و

مکان کا ہے، افعال و افکار کا نہیں +

طنزیات کی ابتدا انہی بدمستیوں اور برہنگیوں سے ہوئی ہے۔ یہاں اس امر کا بھی جائزہ لے لینا چاہئے کہ یہ ہنسی، دل لگی یا سب وشتم کس نوعیت کا ہوتا ہوگا، غالباً اس حقیقت سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ سب انسان کے جذبات میں تموّج ہوتا ہے اور اس پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہوتی ہے اُس وقت اس کا لب ولہجہ ہی نہیں بدل جاتا بلکہ ایسی حالت میں اُس کے لب وزبان سے جو کلمے ادا ہوتے ہیں وہ اپنی ترکیب اور بندش کے اعتبار سے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ لب ولہجہ اور ترکیب وبندش کی یہ عجیب نوعیت، فنِ شعر وشاعری میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے جس کا اصطلاحی نام ہم نے اَوزان اور قافیہ وردیف رکھ دیا ہے، آواز اور الفاظ کی انہی مختلف نوعیتوں کو ہم موسیقی سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اصطلاحی اَوزان درحقیقت ہمارے متلاطم جذبات کے اَوزان ہیں جن سے ہم گریز کر سکتے ہیں لیکن انکار ناممکن ہے، چنانچہ عہدِ قدیم کے یونان میں انہیں رنگ رلیوں میں جو طعن وطنز، سب وشتم، ہنسی دل لگی، پھکڑ یا فحاشی پر مشتمل ہوتی تھیں ایک قسم کے بے ربط وزن کا بھی التزام ہونے لگا۔ جس نے مرورِ ایام سے نظم کا جامہ اختیار کر لیا۔ یہی سبب ہے کہ یونان اور رُوم کے جتنے مشہور ہجو گو ہوئے وہ سب کے سب شاعر تھے۔ عربوں کے ہاں بھی ہجو کی تعریف وتشریح میں جو کچھ کہا گیا ہے وہاں نظم کی شرط ایک حد تک لازمی قرار دے دی گئی ہے۔ عربوں میں ہجا سے مراد وہ اشعار ہیں جن میں کسی قوم، کسی فرد، کسی جماعت یا کسی زمانہ کی منقصت کی گئی ہو +

یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ سطائر کا تعلق صرف ڈراما سے ہو یا صرف شعر میں ادا ہو یا طرزِ گفتار تیز اور تلخ ہو۔ دوسری طرف عربی میں ہجا سے وہ اشعار مراد ہیں جن میں کسی قوم، کسی فرد، کسی جماعت یا کسی زمانہ کی منقصت کی گئی ہو +

لیکن یہاں اس امر کو خصوصیت کے ساتھ مدنظر رکھنا پڑیگا کہ جہاں تک ہجو وہجا کا تعلق کسی قوم، فرد، جماعت اور زمانہ کی منقصت سے ہے، وہاں تک تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور یہ امر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہجو وہجا میں منقصت کا پہلو ہمیشہ نمایاں ہوتا ہے اور ہونا چاہئے۔ لیکن رومن، لاطینی اور عربی فضلا نے جو شرطِ شعر کی لگا دی ہے وہ ایک بڑی حد تک غیر ضروری ہے، ہجو وہجا کا ایک اضافی پہلو تو شعر ہو سکتا ہے، لیکن ہجو وہجا کے لئے شعر کو لازمی قرار دے دینا کلیتہً دُور از کار ہے +

بقول ٹھیکرے، طنز ہی حتی الوسع زندگی کے ہر شعبہ پر ناقدانہ نگاہ ڈالتا ہے، ورمکر وفریب، رعونت ومنافقت حق وباطل کے خلاف اس طور پر جہاد کرتا ہے کہ بالآخر ہمارے جذباتِ مرحمت، رحمت یا نفرت وحقارت کو تحریک ہوتی ہے اور ہم اُن جذبات کو برسرِ کار لانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مظلوم اور ناتوان کے لئے شفقت محسوس کرتے ہیں اور ظالم

جابر کو قابلِ نفرین و ملامت تصور کرتے ہیں +

تھیکرے نے ہجو و ہجا کے باب میں جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ ایک طور پر ہجو و ہجا کے عمل و اثر سے متعلق ہے اور دراصل ہجو و ہجا کے صحیفۂ اخلاق سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ہجو و ہجا کی مُسلّمہ تعریف کیا ہے انگریزی اُدبا اور فضلا کا ایک حد تک متفقہ خیال یہ ہے :-

"ہجو و ہجا (طنزیات کے مفہوم میں) کا مقصد یہ ہے کہ کسی بے ہنگام یا مضحکہ خیز واقعے یا حالت پر، ہمارے جذبۂ تفریح یا نفرت کو تحریک ہو بشرطیکہ اس ہجو یا طنز میں ظرافت یا خوش طبعی کا عنصر نمایاں ہو اور اُسے ادبی حیثیت بھی حاصل ہو۔ اگر ان حیثیتوں کا فقدان ہوا تو پھر یہ محض گالی گلوچ یا دہقانوں کی طرح مُنہ چڑانا ہوگا"

(انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)

اس تعریف کو ہجو و ہجا کی بیسویں صدی عیسوی کی تعریف کہہ سکتے ہیں ورنہ رومن اور لاطینی طنز نگین کی ایک بڑی تعداد جن کے یہاں سوا پھکڑ اور فحاشی کے کچھ اور نہیں ہے طنز یئین کے صنف سے خارج ہو جاتے ہیں دوسری طرف اُن طنز یئین کی تصانیف کو وہ ادبی حیثیت بھی حاصل نہیں ہے جو انگریزی فضلا کے پیشِ نظر ہے +

اصلاً ہجو و ہجا سے تنقیص و تعریض مراد ہوتی ہے۔ ایسی تنقیص یا تعریض جس سے جذبۂ تفریح یا نفرت کو تحریک ہوتی ہو۔ راقم السطور کا ذاتی خیال ہے کہ اس قسم کی تنقیص یا تعریض کو ادبی حیثیت حاصل ہو یا نہ ہو اُن کا اپنے مورد پر پورے طور پر چسپاں ہو جانا ازبس لازمی ہے اگر یہ پورے طور پر (بقولِ شخصے) "چپک نہیں جاتیں" تو پھر اُن کو ہجو و ہجا یا طنزیات کے بجائے "[illegible]" کہنا زیادہ موزون ہوگا۔ ہجو و ہجا کے سلسلہ میں بہت سے الفاظ جملے یا لطیفے ایسے ہو سکتے ہیں جو ادب کی کسوٹی پر صحیح اُترنا تو درکنار اس کے قریب بھی نہیں لائے جا سکتے، لیکن اپنے مفہوم در موقع و محل کے اعتبار سے اِتنے موزوں اور برجستہ ہو سکتے ہیں کہ اُن پر ہجو و ہجا کا پورے طور پر اطلاق ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ بہت سی چیزیں ادبیت سے معرّا ہو سکتی ہیں با اینہمہ یہی نہیں کہ اکثر مذاقِ سلیم پر قطعاً بار نہیں ہوتیں بلکہ مذاقِ سلیم اُن کا شکر گزار بھی ہوتا ہے +

نظر بر آں ہجو و ہجا سے ایسی تنقیص، تعریض یا تضحیک مراد ہے (اور اس میں وہ تمام الفاظ، آواز، انداز، حرکات و سکنات اور اشارات شامل ہیں جو ...... فرض کر لیجئے کانگریس سے منسوب کئے جا سکتے ہیں اور جن کے خلاف آرڈیننس نافذ ہو چکے ہیں) جو اپنے مورد پر ہر حیثیت سے یا کسی نہ کسی پہلو سے لیکن پورے طور پر چسپاں ہوتی ہو۔ اب رہا یہ امر کہ کس طور پر یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے ہمارا ذاتی خیال ہے کہ تنقیص یا تعریض کے لئے لازم ہے

کہ یہ حقیقت پر مبنی ہو۔ اِس سلسلہ میں بے موقع نہ ہوگا اگر یہاں وہ اصول پیش کر دیئے جائیں جو ہجو و ہجا کے صحیفۂ اخلاق میں عربوں کے یہاں ملتے ہیں +

(۱) جو چیز فی نفسہٖ قبیح یا مکروہ ہے اُس کی ہجو کی جاسکتی ہے +

(۲) جسمانی یا فطری نقائص یا معائب کی مذمت ناروا ہے +

(۳) آبا و اجداد کی فروگذاشت پر اولاد کو موردِ لعن طعن قرار دینا ناجائز ہے +

(۴) اُنہیں معائب کو قابلِ گرفت تصور کرنا چاہیئے جو عقل کے نزدیک قابلِ گرفت ہوں +

(۵) بہترین ہجو وہ ہے جو جلد ذہن میں محفوظ ہو جائے جس کی ترکیب اور معنی میں پیچیدگی نہ ہو جس کو عام مذاق جلد قبول کرے اور صرف قبول ہی نہ کرے بلکہ اُس کو صحیح بھی سمجھتا ہو، وغیرہ +

"ہندُستانی"

ہندی گیت

یہ من دُکھیا رو بیاکل شیام بنا!
جیسے پھُول بِن باس
جیسے ہردے بِن آس
جیسے انکھیاں سوجھ بنا
یہ من دُکھیا رو بیاکل شیام بنا!
جیسے برچھ بن پات
جیسے کنیا بن مات
جیسے ناری ناتھ بنا
یہ من دُکھیا رو بیاکل شیام بنا!

"یادگار"

انگریزی

اَیولِن

(۱)

حسین اَیولِن ——— مر چکی ہے ——— مَیں چاہتا ہوں کہ چند گھنٹے اس کے پاس تصور کی گہرائیوں میں غرق ہو کر گزاروں!

یہ اُس کی کتابوں کی الماری ہے، یہ اُس کا بستر ہے، یہ پھول ہے جو اُس نے ابھی ابھی توڑا تھا، اور جو شیشے کے گلاس میں اُس کی رُوح کی پرواز کے ساتھ ہی مُرجھا رہا ہے۔ دروازے بند پڑے ہیں۔ کمرے میں کوئی روشنی نہیں، صرف دو شعاعیں دروازوں میں سے اندر داخل ہو رہی ہیں +

وہ سولہ برس کی تھی جب وہ اِس دُنیا سے چل بسی شاید وہ میرے نام سے بھی واقف نہ تھی۔ ابھی اُس کی عمر ہی کیا تھی کہ وہ محبت کو سمجھتی۔ اِس کے علاوہ اُس کی زندگی بیحساب اُمیدوں اور بلند مقاصد سے معمور تھی ——— بہت سے فرائض اور کم تفکرات سے! حتیٰ کہ کسی مخفی طاقت نے اچانک اُسے اوپر اُٹھا لیا!! اب صرف اُس کی دلفریب سنہری بھویں اُس کے حُسن کا آخری نشان ہیں +

(۲)

اَیولِن! کیا اب اِس کا وقت نہیں رہا کہ تیرے اور میرے درمیان کوئی رشتۂ محبت قائم ہو؟ کیا اِس لئے کہ تیری رُوح میں بلندی اور پاکیزگی تھی اور بااقبال ستارے تیری پیدائش پر طلوع ہوئے تھے؟ کیا اِس لئے کہ میرا سن تجھ سے تین گُنا بڑا ہے؟ کیا اِس لئے کہ ہماری ملاقات میں ناقابلِ اندازہ بُعد حائل ہو چکا ہے؟ اور کیا اِس لئے کہ سوائے انسان ہونے کے ہم دونوں میں کوئی دُنیاوی تعلق نہیں؟

(۳)

نہیں نہیں! وہ خدائے بزرگ و برتر جس نے اُلفت کو پیدا کیا پہلے محبوب کے دل میں عشق کی آگ بھڑکاتا ہے! تو مَیں اپنی اُلفت کی بِنا پر تجھ سے اُلفت کی درخواست کرتا ہوں، خواہ اس کے ایفا میں صدیاں گزر جائیں، خواہ تجھ سے ملنے کے لئے مجھے ایسے سینکڑوں جہانوں کا سفر کرنا پڑے۔ مگر وہ وقت آخر کار آنے والا ہے اور آ کر رہیگا،

جبکہ اے میری محبوبہ ـــــ مَیں سمجھ سکونگا کہ تیرا معصوم اور پاک وجود دُنیا میں کیا مقصد لے کر آیا تھا؟ تیری سُنہری زلفیں کیوں اِس قدر جاذبِ نگاہ تھیں؟ تیرے ہونٹ کیوں اِس قدر سُرخ اور دلرُبا تھے ـــــ دلرُبا، گلاب کی طرح *

(۴)

مجھے تجھ سے بے اندازہ محبت ہے۔ اور اگرچہ میرا دل اُلفت سے معمور ہے مگر پھر بھی اِس میں تیرے دلفریب تبسم کے لئے، سُرخ لبوں کے لئے، اور سُنہری بالوں کے لئے جگہ باقی ہے!

اِس لئے، دیکھ! مَیں یہ پنکھڑی تیرے یخ بستہ سفید ہاتھ میں بند کئے دیتا ہوں، جب تُو دوبارہ اُٹھے تو یاد کر لینا اور سمجھ جانا ـــــ!!

طاہر قریشی

رُوسی

فقیر

مَیں بازار میں سے گذر رہا تھا .... مجھے ایک ضعیف و ناتوان بڈھے نے ٹھیرا لیا۔ لال انگارہ سی اشک آلود آنکھیں، نیلے نیلے ہونٹ، نا ملائم چیتھڑے، گلے سڑے زخم .... آہ! اس بدنصیب کا غربت نے کیا حال کر دیا تھا!

اُس نے اپنا سرخ زخمی، میلا کچیلا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا، اور نہایت دردانگیز آواز میں مجھ سے مدد کا طالب ہوا *

مَیں نے اپنی تمام جیبیں ٹٹول ڈالیں .... میرا بٹوا کہیں نہ تھا۔ نہ گھڑی، نہ رومال ..... مَیں کچھ بھی اپنے ساتھ نہ لایا تھا۔ فقیر بدستور ہاتھ پھیلائے میرے انتظار میں تھا۔ اور اُس کا ضعیف و ناتواں ہاتھ کمزوری سے ہل رہا تھا۔ اور کانپ رہا تھا *

گھبرا کر اور شرمندہ ہو کر مَیں نے اُس کے میلے کچیلے لرزتے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ......

میرے بھائی! خفا نہ ہونا، میرے پاس کچھ نہیں "

فقیر نے اپنی لال انگارہ سی آنکھوں سے میری طرف غور سے دیکھا۔ اُس کے نیلے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ

نمودار ہوئی، اور اب میری ٹھٹھری ہوئی انگلیاں، اُس کی گرفت میں تھیں ٭

اُس نے اپنی ضعیف و ناتواں آواز میں کہا "پھر کیا ہُوا بھائی! مَیں اب بھی تمہارا شکر گزار ہوں۔ تمہارے یہ الفاظ ہی میرے لئے ایک تحفہ ہیں بھائی!"

مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے مجھے بھی اپنے بھائی سے ایک تحفہ ملا ہے ٭

کمرے میں ہمیں دونوں ہیں، میرا کُتّا اور مَیں .... باہر ایک خوفناک طوفان کا شور و غل برپا ہے ٭

کُتّا میرے سامنے بیٹھا ہے اور ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہا ہے۔ اور مَیں بھی اُسکی طرف دیکھ رہا ہوں ٭

معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ وہ گُونگا ہے، الفاظ سے محروم، وہ اپنے آپ کو نہیں سمجھتا، لیکن مَیں اُس کو سمجھتا ہوں ٭

مَیں سمجھتا ہوں۔ کہ اِس وقت اُس میں اور مجھ میں ایک ہی احساس کار فرما ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ ہم ایک ہیں یا ہم میں سے ہر ایک کے اندر ایک ہی لرزتا ہُوا شعلہ روشن ہے ٭

موت اپنے سرد اور وسیع پروں کی ایک ہی جنبش سے نیچے آ اُترتی ہے .... اور انجام آ پہنچتا ہے ٭

پھر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ ہم دونوں کے اندر ایک ہی شعلہ روشن نہ تھا۔ ہاں ہم جو ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ حیوان اور انسان نہیں ہیں .... یہ آنکھیں ہم رُتبہ ہستیوں کی آنکھیں ہیں، یہ آنکھیں جو ایک دوسرے پر جمی ہوئی ہیں۔ اور دونوں ہستیوں میں، حیوان میں اور انسان میں ایک ہی زندگی ہے جو طوفان سے خائف ہو کر دوسرے کی طرف بڑھ رہی ہے" ٭

"افسانہ"

فہرست مضامین

بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۳ء

جلد ۸ — تصویر:- آخری خبر — نمبر ۶

(ایم ہادی حسین (جعفر) پرنٹر پبلشر نے مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ادبی دنیا ... بلڈنگ ہال روڈ لاہور سے شائع کیا)

آئینۂ عالم

سائنس کی تاریخ ۱۵۱ الفاظ میں

شکاگو میں دنیا بھر کی علمی ترقیات کے متعلق ایک نمائش منعقد ہوئی ہے۔ ایوانِ سائنس کی اشیا کے انتخاب اور نمائش کا انتظام یہاں ڈاکٹر ہنری کریو کے سپرد تھا۔ معلمی کو چھوڑنے سے پہلے ڈاکٹر کریو نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی میں سائنس کی تاریخ کے پروفیسر تھے جو ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

گذشتہ صدی کی سائنس کی تاریخ کو ایجادات و اختراعات کے نمونوں سے ظاہر کرنا خود ایک بہت بڑی بات ہے۔ لیکن ڈاکٹر کریو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھے ہیں۔ اُنھوں نے سائنس کی تاریخ ایک سو اکاون الفاظ میں لکھ کر ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہے جسے مدتوں اجمال و اختصار کا شاہکار تسلیم کیا جائے گا۔ یہ الفاظ ایوانِ سائنس کے بڑے کمرے کی ایک دیوار پر نہایت آراستہ کر کے لکھے گئے ہیں۔

"فیثاغورث نے کائنات کا نام رکھا۔ اقلیدس نے علم ہندسہ کی تدوین کی، ارشمیدس نے طبیعیات کی۔ زینوفین نے افلاک کی تفرید کو معلوم کیا۔ کوپرنیکس نے اِس ایک کے مرکز میں ہمارے چمکتے ہوئے سورج کو جگہ دی۔ طبیعی اجسام کی حرکات میں گلیلیو نے ایک ضابطہ محسوس کیا، پھر اس سے نیوٹن نے عالمگیر جاذبیت کا اصول معلوم کیا۔ دیمقراطوس نے مادے کی ترکیب میں نظریۂ جوہر کی جھلک دیکھی، ڈالٹن نے اسے ثابت کر دیا۔ جب انیسویں صدی میں لامرک اور ڈارون نے عضوی ارتقا کا عظیم الشان اُصول باندھا تو زندگی کا علم پہلی مرتبہ فطرت کی عالمگیر ترقی کی شکل میں نظر آیا۔ علمی ترقی کی صدی میں اورسٹیڈ اور فیراڈے نے برقی مقناطیسیت کے نظریے کو پیش کیا۔ اور میکسویل اور ہرٹز نے اِسے ترقی دی۔ بیکرل اور ٹامسن کی تحقیقات سے لیکر آج تک جوہروں اور برقیوں کے متعلق انکشافات ہو رہے ہیں۔ اور پلینک کا نظریۂ مقدار اور آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت سائنس کے نئے دَور کا افتتاح کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر کریو کی اِس مجمل تاریخ پر اعتراض بھی ہو سکتے ہیں، لیکن اگر کوئی اِسے اس سے بہتر طریق پر لکھ سکتا ہے تو لکھ کر دکھائے +

آخری خبر

اقتصادیات اور عورتیں

مسز ٹی جینین کوپن ہیگن، ڈینمارک کی ایک فاضل خاتون ہیں جنہوں نے کئی ملکوں کی سیاحت کی ہے اور بہت سی معاشرتی خدمات انجام دی ہیں۔ بین الاقوامی نسوانی کانگریس میں جو شکاگو میں منعقد ہوئی اور جو تاریخ میں عورتوں کی پہلی اقتصادی کانفرنس تھی۔ اُنہوں نے کہا:-

" دنیا کو اِس وقت عورتوں کی حکومت کی ضرورت ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسائلِ حاضرہ کو حل کرنے کے لئے عورتوں کو سرگرمِ عمل ہونا چاہیئے۔ ڈینمارک میں مجھے مردوں کا دشمن خیال کیا جاتا ہے لیکن یہ غلط ہے۔ مَیں مردوں کی دشمن نہیں ہوں لیکن مَیں مردوں کو اپنی صنف پر فوقیت دے کر اُن کے سامنے سرخم کرنا نہیں چاہتی کیونکہ اُن میں کوئی فوقیت نہیں ہے۔ عورتیں جو اقوام کے گھروں کی مالک ہیں روپے اور اس کے اہتمام و انصرام کو مردوں سے بہتر سمجھتی ہیں۔ لیکن مرد انہیں اس کا موقع نہیں دیتے "

مسز جینسن تحدیدِ نسل کے معاملے میں خاص دلچسپی لیتی ہیں، اور وہ سکنڈینیویا کی انجمنِ تحدیدِ نسل کی صدر ہیں اُنہوں نے کہا۔

" اگر عورتیں امنِ عالم کی خواہشمند ہیں تو انہیں بین الاقوامی طور پر تحدیدِ نسل کی حمایت کرنی چاہیئے، کیونکہ اسی سے مستقبل کی جنگوں کا انسداد ہو سکتا ہے۔ جب ملکوں کی آبادی بڑھ جاتی ہے تو اُنہیں توسیع کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اور جب دو یا دو سے زیادہ وسعت اختیار کرنے والے ملک ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ ڈینمارک میں تحدیدِ نسل کی معلومات بہم پہنچانا قانونی طور پر جائز ہے۔ وہاں دو سَو طبیب ایسے ہیں جو غریب عورتوں کو بلا معاوضہ تحدیدِ نسل کے متعلق معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور اس کے علاوہ وہاں اِس قسم کا ایک اسپتال بھی ہے "

اُنہوں نے کہا " میرے دل میں یہ پختہ خیال ہے کہ اگر عورتوں کو اقتصادی حالات کا علم ہو یا اُن کو اِن حالات سے آگاہ کیا جائے تو وہ اپنے بچوں کو افلاس کی نذر ہونے سے ضرور بچائیں گی "

" یہ میرا عقیدہ اور مشاہدہ ہے کہ مردوں نے اپنے رُجحانات میں ترقی نہیں کی لیکن عورتوں نے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں آج کل کی دُنیا میں عورتوں کو برسرِ اقتدار دیکھنا چاہتی ہوں "

" تہذیب ہمارا مشترک مقصد ہے " بین الاقوامی نسوانی کانگریس نے اِن الفاظ کو اپنا کلمہ بنا لیا ہے، اور دُنیا کے مختلف ممالک سے خواتین اِسی مقصد کی تکمیل کیلئے شکاگو میں جمع ہوئی ہیں۔ اِن میں قابلِ ذکر خواتین یہ ہیں۔ انگلستان کی مس مارگیرٹ بانفیلڈ، سابق وزیر عمال، بیرنس کیکی آئشی موٹو، جاپانی خواتین کی لیڈر، مادام کریمر باش، فرانسیسی وکیل اور خواتین کی نمائندہ۔ سینورا جیرونیما مسکوئیٹا، نمائندہ برازیل، مس ونیفرڈ کڈ جو تحدیدِ اسلحہ کی کانفرنس میں کینیڈا کی ایک

نمایندہ تھیں، اور ڈاکٹر کرسچین گیلیری رومانین معلمہ۔ یہ سب مل کر موجودہ دنیا اور اُس کے مستقبل پر بحث کریں گی۔

زمین کی کشش کو عشق سے کوئی تعلق نہیں

مسٹر فرینک وال نے جو لانگ آئیلینڈ سٹی کے ایک اخبار کے مضمون نگار ہیں اور زندگی کے مسائل کی تحقیقات کرتے رہتے ہیں حال ہی میں پروفیسر آئن سٹائن کو لکھا کہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی گردش دوریہ کے دوران میں کبھی تو انسان اُوپر والی جانب کھڑا ہوتا ہے اور کبھی نیچے والی طرف۔ جب وہ اُلٹا کھڑا ہوتا ہے تو زمین کی کشش اسے تھامے رکھتی ہے۔ اِسی طرح کبھی وہ زمین کے دائیں جانب کھڑا ہوتا ہے کبھی بائیں جانب۔

کیا یہ خیال کرنا درست ہے کہ انسان جب سر کے بل یا اُلٹا کھڑا ہوتا ہے تو اُس سے عشق اور اِسی قسم کی دُوسری حماقتیں سرزد ہوتی ہیں؟

اِس کا اُنہیں مندرجہ ذیل جواب ملا:-

مکرم و محترم۔ عشق انسان کی سب سے بڑی حماقت نہیں ہے۔ اور نہ زمین کی کشش کو اِس کی وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ والسلام مع الاکرام۔ البرٹ آئن سٹائن۔

فراعنۂ مصر کے مقابر

قدیم مصر کے بادشاہوں کی عزیز ترین آرزو یہ تھی کہ موت کے بعد اُن کے آرام میں کوئی خلل نہ آئے۔ اِس لئے اُن کے مقبرے سنگین بنائے جاتے تھے۔ یہ بھی ضروری سمجھا جاتا تھا کہ مرنے والے کی تمام حاجتیں پوری کی جائیں۔ اِس لئے سونا چاندی بے دریغ استعمال کیا جاتا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ مقبرے کی شان و شوکت ہی اس کی تباہی کا باعث ہوجاتی تھی۔ چند سال بھی نہ گزرنے پاتے تھے کہ چور مقبرے میں گھس کر اُسے غارت کر دیتے تھے۔ کئی دفاعی تدبیریں کی گئیں۔ دروازے کو مضبوط پتھروں سے بند کر دیا جاتا تھا۔ پیچدار سڑکیں تعمیر کی جاتی تھیں۔ چور دروازے بنائے جاتے تھے۔ ہر ممکن طریقہ برتا جاتا تھا۔ لیکن چوروں کا استقلال اور تجربہ ہمیشہ ان سب مشکلات پر غالب آتا تھا۔

بادشاہ مقبروں کی دیکھ بھال کے لئے محافظ مقرر کرتے تھے! اور انہیں معقول وظائف دیتے تھے لیکن یہی محافظ رشوت

لیکر چوروں کے ساتھ مل جاتے تھے۔ اس لئے کوئی مقبرہ بھی چوروں کے ہاتھوں سے محفوظ نہ رہتا تھا۔ آخر ایک بادشاہ کو پوشیدہ مقبرے بنانے کی تجویز سُوجھی۔ طٹمس اوّل کا مقبرہ انسان کی پہنچ سے دُور ایک ویران جگہ میں بنایا گیا۔ اور اس کے بعد یہی جگہ بادشاہانِ مصر کی آخری آرامگاہ قرار پائی۔ لیکن یہ قبرستان بھی انسانی دستبرد سے محفوظ نہ رہا۔ خوش قسمت چور وہاں بھی پہنچ گئے۔ اور اب محکمۂ حضریات کے کارکنوں کی کوششوں کے طفیل فراعنۂ مصر کی تشہیر میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔

طوطنخ آمن کے مقبرہ کی دریافت مسٹر ہاورڈ کارٹر محکمۂ حضریات کے افسرِ اعلیٰ کا بہترین کارنامہ ہے۔ اُنیسویں صدی کے جرمن اور برطانوی افسروں نے اِس قبرستان کے چپے چپے کو کھود ڈالا تھا۔ اور مسٹر کارٹر کو یہ افسوس تھا کہ اُن کے لئے کوئی قابلِ قدر بات باقی نہیں رہی۔ لیکن قدرت نے طوطنخ آمن کے مقبرے کی دریافت انہیں کی قسمت میں لکھی تھی۔ جب محکمۂ آثارِ قدیمہ والے اپنی کارگذاری پر پھُولے نہ سماتے تھے۔ اور اس خیال میں مست تھے کہ مصری تاریخ کا کوئی نشان اُنکی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں۔ عین اُس وقت چور دُنیا کے شاندار ترین تاریخی مقبرے کو لُوٹ لُوٹ کر دولت اکٹھی کر رہے تھے۔ طوطنخ آمن کو مرے تقریبًا تین ہزار سال ہوئے تھے کہ ایک شخص عبدالرسول کی عقابی نگاہ اُس کے مقبرے کی دولت پر پڑی۔ عبدالرسول نے زر و جواہر سمیٹنا شروع کئے۔ لیکن تمام چیزوں کو سمیٹنا اُس کی ہمت سے باہر تھا۔ اِس لئے اُس نے اپنے تمام کنبے اور عزیز و اقارب کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ چھ سال تک وہ تمام خوب تن دہی اور محنت سے اپنے کام میں مشغول رہے۔ لیکن آخر کار راز فاش ہو گیا اور سب کے سب دھرے گئے۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ والوں نے فراعنۂ مصر کی وراثت پر قبضہ کر لیا۔ اور اپنی دولت کا جائزہ لینا شروع کیا لیکن ہر جگہ چور اُن سے پہلے پہنچ چکے تھے اور اپنے نشانات چھوڑ گئے تھے۔ قصہ مختصر وہ بچی کھچی چیزوں کو سنبھال قاہرہ کے عجائب گھر واپس پہنچے۔ طوطنخ آمن کے تابوت کو اُس کے مقبرہ ہی میں چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اُس کی گشتی ساز و سامان سمیت قاہرہ میں پہنچ چکی ہے۔ اِس لئے اُسے سفرِ آخرت میں محکمۂ آثارِ قدیمہ کا دستِ نگر ہونا پڑے گا۔

منصور احمد

”ادبی دُنیا“ کے چندے میں مزید رعایت

اِس ماہ سے ادبی دُنیا کے چندے میں ہم اپنے معاونین کو مزید رعایت دے رہے ہیں۔ سالانہ چندہ صرف چار روپے سات آنے اور سال بھر کی ڈاک اور وی پی کا محصول نو آنے شامل کر کے کل پانچ روپے وصول کئے جائیں گے۔ منی آرڈر بھیجنے والے اصحاب چار روپے چودہ آنے بھیجیں۔ ممالکِ غیر سے گیارہ شلنگ کی بجائے دس شلنگ لئے جائیں گے۔

مینیجر

عدالت

ایک مختصر سے سٹیشن کی عمارت میں فوجی عدالت کا اجلاس ہو رہا تھا۔ ایک ملزم کو اندر لایا گیا جسے عین موقع پر گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کے خلاف الزام یہ تھا کہ اس نے ایک مجروح سپاہی کو قتل کر دیا۔

وہ ابھی جوان تھا۔ زرد رُو۔ خوف کے پسینے میں نہایا ہوا۔ اس کے لبوں سے جو بندوق کے کُندوں سے زخمی کر دئے گئے تھے۔ خون ٹپک رہا تھا۔ بار بار وہ اپنے آلودہ ہاتھوں سے بہتے ہوئے خون کو چہرے پر مل لیتا تھا۔ اس کے ہاتھ اتنے زخمی تھے کہ ہڈی نظر آ رہی تھی۔

ایک نفرت انگیز ــــ لرزاں ــــ غلیظ اور افسردہ ملزم ــــ معیارِ انسانیت سے گری ہوئی ایک گھناؤنی اور مکروہ چیز!

صدرِ عدالت نے اس سے کچھ سوال کئے۔ ملزم نے جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنا نام بھی بیان نہ کیا وہ ہر طرف خوف اور زہرناک حقارت کی نظریں ڈال رہا تھا ــــ پھر سپاہیوں نے اپنی شہادت دی۔ بڑے شور و غل سے! کینہ آمیز احساسِ فرض کے ساتھ ــــ

معاملہ بالکل صاف تھا۔ ملزم نے ایک مجروح سپاہی کو قتل کر دیا تھا۔ اور اس کی رِسٹ واچ اتار رہا تھا کہ پکڑا گیا

صدرِ عدالت نے انگلیوں سے میز کو ٹھکراتے ہوئے کہا "مزید سوالات کی ضرورت نہیں۔ فوجی قانون کے مطابق میں اس شخص کو موت کی سزا دیتا ہوں ــــ لے جاؤ!"۔

ملزم کی سمجھ میں ایک حرف نہ آیا۔ بغیر کسی مدافعت کے وہ پٹر پٹر کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ ساتھ ساتھ اپنے ہونٹوں کو اپنے خون آلودہ ہاتھوں سے صاف کرتا جاتا تھا۔

مقدمہ ختم ہو چکا تھا!

صدرِ عدالت نے پیٹی کھول کر تلوار ایک طرف رکھ دی اور ہوا کھانے کے لئے سٹیشن سے ذرا دُور نکل گیا چاندنی رات تھی ہر چیز مرمریں روشنی میں پتھریلی نظر آتی تھی۔ سفید سڑک۔ سفید چمکتے ہوئے سبزہ زار حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے شفاف سپیدی مرمریں آرزو۔ لذلی

اور دردناک اضطراب! حدِ افق تک ـــــ اور حدِ نظر سے اور امنور اور دردانگیز خاموشی ـــــ رات ایک چمکتی ہوئی بے جان وبے حس بستہ تصویر کی طرح تھی۔ ایک تارا تک نہیں چمکتا تھا۔ روشنی کے آثار قطرت سے گم ہو چکے تھے۔ کائنات میں کچھ نہ رہا تھا سوائے ایک منجمد نور کے!

صدرِ عدالت نے اپنا سر جھکا دیا۔ ریلوے سٹیشن کے ویٹنگ روم میں سوئے ہوئے سپاہیوں کے خراٹوں کی آواز آرہی تھی تاریکی ان وحشت مندول افروز خراٹوں کے ذریعے اپنے آپ کو چاندنی رات کی عظمت سے بچانا چاہتی تھی گویا اپنے خوف کو کم کرنے کے لئے خود تاریکی ان خراٹوں میں بول رہی تھی۔ کسی جگہ اس تاریکی میں ریل کی لائن سے پرے ایک جھونپڑی تھی۔ جہاں ملزم قید تھا۔ اور وہاں تاریکی اور خاموشی تھی۔ اور صرف ایک چھوٹے سے روزن سے خوفناک روشنی داخل ہو رہی تھی۔ صدرِ عدالت کے ماتھے پہ اضطراب کا پسینہ آگیا۔ اسے یاد آیا کہ ملزم نے اپنی نگاہیں اُس کے ماتھے پر گاڑے رکھی تھیں۔ یکایک پسینے کا ایک قطرہ بہ کر اس کے چہرے پر آگیا ـــــ ایک اور ـــــ پھر ایک اور ـــــ پیشانی آنسو بہا رہی تھی۔

افسوس ـــــ! کیا روشنی کے اس سرد کہرے میں ہر چیز بے جان ہو چکی تھی۔ ! کسی درندے کی حرکت کا احساس نہ ہوتا تھا۔ کوئی چیز گھاس میں سرسراہٹ پیدا نہ کرتی تھی۔ کسی پرندے کی آواز اس سکوت کو نہ توڑتی تھی۔ توکیا پھر تمام چیزیں سائے ہیں ـــــ صرف ایک حیرت انگیز روشنی اور ایک تنہا انسان! چمکتی ہوئی کہر میں لرزاں۔

یکایک ایک وسیع و عظیم الشان آواز سنائی دی گویا چاندنی بول رہی تھی۔ کوئی قانون نہیں ہے۔ حاکمِ عدالت کا جسم تن گیا ـــــ کون یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ دنیا میں کوئی قانون نہیں ہے۔ ہم قانون سے اسی طرح گھرے ہوئے ہیں جس طرح حدود افق سے۔ اگر ہم قانون سے مجبور نہ ہوں تو کوئی کام کس طرح کریں اگر قانون نہ ہو تو میں اپنے تئیں سپاہیوں پر کس طرح حکم چلا سکتا ہوں۔ اگر قانون نہ ہوتا تو میں اس وقت کہاں جاتا۔ قانون نہ ہوتا تو انصاف نہ ہوتا۔ انسان قانون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ قانون فنا ہو جائے گا تو ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ اور دنیا بوسیدہ ہو کر گر پڑے گی۔

پھر اسی آواز نے چاندنی کے ذریعے جواب دیا۔

"کوئی انصاف نہیں ہے"۔

حاکمِ عدالت نے احتجاج کیا تمہیں یہ بات کہنے کی کس طرح جرأت ہو سکتی ہے۔ میں نے ملزم کو اس لئے سزا دی تھی کہ اس نے ایک مجروح سپاہی کو مار ڈالا تھا۔ میں نے قانون کے نام پر اُسے سزا دی تھی۔ اور اگر قانون نہ ہوتا تو میں اپنے ضمیر کے کہنے کے مطابق عمل کرتا۔ اور اُسے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالتا۔ میں اس کا سر پستول سے پھوڑ دیتا"۔

ازلی آواز پھر آئی "کوئی ضمیر نہیں ہے"۔

صدرِ عدالت تن کر کھڑا ہو گیا کہ اس خوفناک آوا

کا مقابلہ کرے۔ اس نے ہوش میں آ کر کہا "پلیٹ فارم کی طرف دیکھو جہاں تین مقتول سپاہی خاک و خون میں پڑے ہیں۔ تینوں جوان جو آج صبح زندہ تھے صبح کے وقت وہ ہنس رہے تھے اور باتیں کرتے تھے — تم خود بھی مر جاؤ گے۔ صدمے سے غم سے خوف سے اضطراب سے۔ اور دیوانگی کے جوش سے — اور راستی کے نام پر ضمیر کے نام پر تم بھی ملزم کو بری ہی طرح سزا دو گے۔ تم اگر خدا ہو تو بھی وہی کرو گے جو میں نے کیا"

وہ آواز جو چاندنی کے ذریعے بولتی تھی۔ خاموش ہو گئی تنہا انسان نے آسمان کی طرف دیکھا جو ایک وسیع سفید گنبد کی طرح منجمد نور سے لبریز تھا۔ پھر آواز آئی "کوئی خدا نہیں ہے۔"

حاکم عدالت کانپنے لگا۔

"یقیناً گھاس کا حقیر ترین پتہ۔ شاہراہ کے ذرے سفید پتھر اور مجرمانہ خون کے وہ قطرے جو دہلیز پر جمے ہوئے ہیں اٹھ کھڑے ہونگے۔ اور اس آواز کے برخلاف احتجاج کرینگے۔ یقیناً یہ تمام چیزیں خدا کی حقانیت پر گواہی دیں گی — کم از کم وہ کچھ کہیں گی — کم از کم وہ اپنی نفرت کا اظہار کریں گی —"

لیکن نہیں — خاموشی! موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ صرف ایک سپاہی نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔ حرکت بند تھی۔ نظام کائنات خاموش تھا۔

حاکم عدالت نے اپنے بال نوچنے شروع کر دئے "اف! میری روح سے اس آواز کے برخلاف کوئی آواز کیوں نہیں نکلتی۔ خدا کی طرف سے کوئی اشارہ کیوں نہیں ہوتا — میری کوئی مدد کیوں نہیں کرتا —؟"

پہرا بدلا۔ ایک سپاہی کھانستا ہوا اٹھا۔ اور بندوق اپنے کاندھے پر رکھ لی۔ حاکم عدالت کو ایک لالٹین کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر آئی۔ گرم۔ نم آشنا! اور اس نے اس روشنی کو دنیا کی طرف سے ایک پیغام دوستی سمجھا۔

لائن کے قریب جو لاشیں پڑی تھیں چاندنی کا نقاب ان کو ایک خوفناک اور یخ بستہ شکل میں تبدیل کر رہا تھا۔ دور ایک سنگین چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی ہر طرف سفید چپ۔ صیاد سینے والی سفید روشنی تھی — کچھ نہیں کائنات میں کچھ نہ تھا۔ صرف کائنات تھی۔

حاکم عدالت نے دیوانہ وار دوڑنا شروع کر دیا۔ دوڑتا جاتا تھا اور چلاتا جاتا تھا "ضمیر کچھ نہیں ہے — "قانون کچھ نہیں ہے" — "انصاف کچھ نہیں ہے" — "خدا کچھ نہیں ہے" —!

(کارل چپیک)

عابد۔ ایم۔ اے

وُہ

وہ علم ہیں جس کے اوّل سے ہر رازِ نہاں ہستی ہے
وہ جس کے اشاروں پر رقصاں عالم کی بلندی پستی ہے

وہ جس کی نظر کے تاروں سے وحشی کا گریباں سلتا ہے
وہ جس کے تجلّی خانے سے خورشید کو جلوہ ملتا ہے

وہ جس کا وظیفہ کرتے ہیں کہسار کے بیخود نظارے
وہ جس کی لگن میں رہتے ہیں اہلِ صفا کے رخسارے

وہ جس کی نگاہیں رہتی ہیں ہریالی کی رکھوالی پر
وہ جس کی ثنائیں ہوتی ہیں گلزار میں ڈالی ڈالی پر

وہ جس کی رحمت کے نغمے گاتی ہے ہوا برساتوں میں
وہ جس کی یاد ستاتی ہے سردی کی سہانی راتوں میں

وہ دلبر جس کی الفت سے اک نور سا لہرا جاتا ہے
جب باغ کی لرزاں شاخوں میں مہتاب جبیں چمکاتا ہے

وہ نام ہے جس کے چشموں میں تمہیدِ ترنم ہوتی ہے
وہ جس کی نگہ فنزاروں میں تقلیدِ تبسم ہوتی ہے

وہ جس نے ہمیشہ روندا ہے امید کی رخشاں بستی کو
جو راہِ فنا پر لاتا ہے پابندِ قیودِ ہستی کو

وہ جس کی خموشی راتوں کو چھاتی ہے کشادہ گلیوں میں
وہ جس کے تبسم بستے ہیں گلزار کی کمسن کلیوں میں

وہ جس کو سارے عالم میں محبوب شبیہِ انساں ہے
لاریب اُسی کا بندہ ہوں احسان مرا یہ ایماں ہے

احسان بن دانش

مسئلۂ ابدیت

(مسٹر نرندر ناتھ گپتا کے ایک حکیمانہ مضمون کا اقتباس)

طبعیات میں موت و حیات کا مسئلہ نہایت سادہ ہے یعنی یہ کہ پیدائش سے قبل کوئی زندگی نہ تھی، زندگی ہستی کے وجود تک قائم رہتی ہے، اور موت کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں انسان عدم اور ہستی کے منازل سے گزر کر پھر عدم میں چلا جاتا ہے۔ بظاہر اس مسئلے میں کوئی راز نظر نہیں آتا۔

موت کا خوف بلا وجہ اور غلط ہے۔ موت کے بعد انسان پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو پیدائش سے قبل تھی۔ اگر پیدائش سے قبل کوئی وجود نہ تھا تو موت کے بعد بھی کوئی وجود نہ ہوگا۔ اگر موجودہ زندگی سے قبل کوئی وجود تھا تو ممکن ہے کہ موت کے بعد بھی کوئی وجود ہو۔ بہرحال موت و حیات کے تعلق کے سلسلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

موت کا خوف جسمانی خوف ہے۔ اور یہ محض اس خیال سے پیدا ہوتا ہے کہ کسی دن جسم سے زندگی چھن جانیوالی ہے جب کسی آدمی کو تازیانہ لگنے والا ہوتا ہے تو ہوا میں تازیانے کی گونج سن کر اس کے بدن میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں خوف ایک آئندہ کرب کے علم سے ہوتا ہے۔ آدمی کو اس کا علم ہوتا ہے کہ تازیانہ لگنے سے بدن میں ایک خاص قسم کا درد ہوگا۔

لیکن موت کا خوف ایک نامعلوم چیز کا خوف ہے۔ بہت سے آدمی جنت و دوزخ کے قائل ہی نہیں۔ جنت و دوزخ کا تصور اس خلا کو پر کرنے کیلئے کیا جاتا ہے جو موت سے بعد واقع ہو جاتا ہے جنت و دوزخ کی تعمیر ارضی عناصر سے کی جاتی ہے۔ دوزخ کے تمام مصائب کے اجزائے ترکیبی ارضی آفات سے جمع کئے جاتے ہیں۔ اور جنت نام ہے دنیاوی مسرتوں کے نچوڑ کا۔ ایسے بہت کم آدمی ملیں گے جو مستقبل کے مواعید پر موت قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔

علاوہ ازیں جنت و دوزخ کا مفہوم حقیقۂ حیات کے مسئلہ کو حل نہیں کرتا۔ ممکن ہے بہت سے آدمی جنت و دوزخ میں جاتے ہوں لیکن وہ آتے کہاں سے ہیں؟ چند ایک مذاہب کے اعتقاد کے مطابق انسان کی ابدیت اسکی پیدائش سے شروع ہوتی ہے۔ ارضی ہستی سے ماقبل زمانہ کے متعلق کوئی قیافہ یا نظریہ قائم نہیں کیا گیا۔

موت کے خوف کی نوعیت کو سمجھنا دشوار نہیں۔ یہ بالکل اُس آدمی کے خوف کی طرح ہوتا ہے۔ جسے ایک چٹان کے سرے پر نیچے گرانے کے لئے کھڑا کر دیا جائے۔ صرف فرق یہ ہے کہ اُس آدمی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ میں موت اُس کی منتظر ہے لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ زندگی ختم ہونے پر اُس کا کون منتظر ہوگا۔ آدمی زندگی سے مانوس ہو جاتا ہے، اور جب تک اُسے موقع ملتا ہے۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے گذرتا رہتا ہے، لیکن جب وہ سطحِ ارض سے علیحدہ ہونے لگتا ہے تو اُسے خوف معلوم ہوتا ہے اور اُسے خائف ہونا بھی چاہیئے۔ کیونکہ اُسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اب وہ کہاں جانے والا ہے۔

تاہم بہت کم آدمی زندگی میں موت کے خوف سے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر موت ایک دائمی خطرہ ہوتا تو زندگی ناقابلِ برداشت ہو جاتی اور لوگ مجنون ہو جاتے۔ دراصل خوف حقیقی ہونے کی بجائے صرف خیالی ہے۔ چونکہ ہم خیالات کو ہر وقت یاد نہیں رکھ سکتے۔ اِس لئے ہم اکثر موت کے خطرہ کو بھی بھول جاتے ہیں۔

ازمنۂ قدیم میں جب بن باسی راجہ یدھشٹر سے ایک پرندے نے استفسار کیا کہ دنیا میں عجیب چیز کونسی ہے؟ تو دانا راجہ نے جواب دیا کہ اِس سے زیادہ اور کیا عجیب ہو سکتا ہے، کہ گو ان گنت آدمی ہر روز مر جاتے ہیں لیکن زندہ انسان یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے لئے کوئی موت نہیں۔ اگلے وقتوں کے یہ لوگ دانا تھے، اور جو کچھ مہابھارت کے ایام میں عجیب ہے وہ آج بھی کم عجیب نہیں۔

پیری کے علاوہ دیگر کئی شکلوں میں موت زندگی کا انتظار کرتی ہے۔ موت کے لئے کوئی قانون، کوئی وقت اور کوئی ضابطہ نہیں۔ صرف زندگی غیر یقینی چیز ہے، لیکن موت ضرور یقینی ہے، گو وہ اپنا وقت خود متعیّن کرتی ہے۔ اِس کے باوجود موت کا خوف زندگی کی مسرتوں کو منغص نہیں کرتا۔ جس طرح فاختہ کسی بلند پرواز عقاب کے سائے سے بعض اوقات خائف ہو جاتی ہے اِسی طرح موت کا خوف بھی گاہے گاہے انسان کو مشوش کر دیتا ہے، لیکن یہ خوف دیرپا نہیں ہوتا۔

موت کے مادی رُخ کی تفہیم نہایت آسان ہے۔ انسانی جسم فانی مادے سے مرکب ہے، اور قدرتی طور پر فرسودہ ہو جانے والی چیز ہے، طویل ترین زندگی ایک قلیل سا وقفہ ہے۔ انسان نے وقت کو ناپنے کا انتظام کر رکھا ہے لیکن درحقیقت وقت بھی فضا کی طرح ناقابلِ اندازہ چیز ہے۔

ہماری زندگی خود کئی اموات کا مجموعہ ہے۔ دیروز کی زندگی ہمارے لئے ایسی ہی مردہ ہو چکی ہے جیسے دس ہزار سال قبل کی زندگی،

زندگی صرف یادداشت کا ایک تار ہے جس پر گذشتہ ایام اُن پھولوں کی طرح لٹکے ہوئے ہیں جو آج کھلے ہوئے ہیں! اور کل مرجھا جائیں گے! اور یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک یہ تار ٹوٹ نہیں جاتا، یا ختم نہیں ہوجاتا +

تاہم ہم یہ جانتے ہیں کہ زندگی کا یہ مفہوم گمراہ کُن ہے۔ یعنی ہماری ہستی صرف ہمارے جسم کے عناصر ترکیبی تک محدود نہیں، اور کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جو ہمارے دماغ میں نہیں سماسکتیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو روح کے متعلق کوئی قیاس آرائی ہی نہ کی جاتی، اور حیات بعد الممات کے مسئلے کا وجود ہی نہ ہوتا۔

زندگی کے معمولی امور کا انحصار جسم کی نازک مشین پر ہے۔ جب یہ مشین کام کرنا بند کردیتی ہے۔ تو جسمانی زندگی ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کا یہ ضروری نتیجہ نہیں کہ انسان کی تمام طاقتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ اِس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کہ کئی آدمی موت کے بعد بھی دوسرے انسانوں کو اپنے اثر سے متاثر کرتے رہتے ہیں۔

فانی شے غیر فانی شے کی تخلیق نہیں کرسکتی۔ فانی انسان میں ایک ابدی چنگاری ہے۔ بہت سے آدمیوں میں یہ پنہاں حیثیت رکھتی ہے، لیکن چند آدمیوں میں شعلہ بنکر لوگوں کے لئے دلیل راہ کا کام دیتی ہے۔

محسوس ہونیوالی اشیا لازمی طور پر فنا ہونیوالی ہیں۔ گوشت اور انسان کی دیگر ملوکات مٹ جانیوالی ہیں۔ کیونکہ قانونِ فنا تمام مادی اشیا پر حاوی ہے۔ عظیم الشان سلطنتیں، بلند و بالا قلعے اور فلک بوس محل ایک دن خاک کا تودہ بن جاتے ہیں! اور پھر زمین کی سطح پانی کی سطح کی طرح ہموار ہوجاتی ہے۔

چونکہ وقت صرف ایک ہی سمت میں متحرک ہے اِس لئے وقت کے سمندر میں کسی طرح کا مدوجزر نہیں۔ ہمیں یہ انتظار کرنے کی ضرورت نہیں کہ وقت پھر روم و یونان کو ازسرِنو اپنے ساحل پر بہالائیگا۔ ماہی گیر اپنے کانٹے کی ڈوری کو پھینک بھی سکتا ہے اور لپیٹ بھی سکتا ہے، لیکن وقت کی جو موج آگے چلی گئی ہے اس کا ایک انچ بھی واپس نہیں آسکتا۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ انسان کے خیالات ہزارہا سال تک زندہ رہتے ہیں۔ اسی حقیقت سے ابدیت کا سُراغ ملتا ہے انسان کا دماغ ایسی چیزوں کی تخلیق کرسکتا ہے جو اُس کے فنا ہونے کے بعد بھی باقی رہتی ہیں۔ ذہن اور عقل سے بلند تر رُوح ہے جو غیر فانی زندگی رکھتی ہے۔ روح عقل سے زیادہ پائدار اور چمکیلی ہے۔ اسی لئے مہاتما بُدھ کی ہستی، والمیکی اور حضرت عیسیٰؑ کا وجود شیکسپیئر سے بلند و ارفع تھا +

ابدیت کا مفہوم ایک اضافی مفہوم ہے اور اس لفظ کو بالعموم حقیقی معنوں میں استعمال نہیں کیا جاتا۔ ابدیت فہم وگمان اور وقت کی قیود سے آزاد ہے۔ وقت کا کوئی آغاز اور کوئی انجام نہیں۔ اسی لئے ابدیت ایک ایسی چیز ہے جس کو محدود نہیں کیا جا سکتا ۔

جب ہم کسی آدمی کے غیر فانی ہونے کا اعلان کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اُس نے کوئی ایسا اہم کام کیا ہے۔ جو کافی عرصہ تک دنیا میں باقی رہیگا یا باقی رہا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ غالب کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا۔ تو اُس وقت ہمارے سامنے اُس کی تصنیفات ہوتی ہیں نہ کہ اُس کی رُوح ۔

ابد سے مراد حشر نہیں، اور نہ مُردوں کا جی اُٹھنا ہے۔ غیر فانی آدمی کی زندگی اور موت میں کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ وہ ہمیشہ وقت کے ساتھ ساتھ زندہ رہتا ہے ۔

اگر ہم 'ابدیت' کے لفظ کو مُبہم طور پر استعمال کرنے کے عادی ہیں تو ہم اُس آدمی کو بھی اچھی طرح نہیں پہچان سکتے جس کو 'ابدی یا غیر فانی' انسان کہا جاتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک آدمی خود پسند واقع ہوا ہے کیونکہ احساسِ ذلت صرف ایک سعی ہوتی ہے خود پسندی سے برسرِ پیکار رہنے کی، لیکن اِس کے باوجود ہم اپنی ذات سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے اور دوسرے آدمیوں کو بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے ۔

کیا آئینہ ہماری ذات کا کامل عکس ظاہر کرتا ہے ؟ ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود ہم آئینہ میں اپنے چہرے اور خط وخال کو دیکھ کر دل ہی دل میں اُن کی تعریف کرتے ہیں ۔ بلکہ کئی ایک حسن وجمال کے پیکر تو خود اپنے آپ سے مسحور ہو جاتے ہیں ۔

آنکھ گوشت کی تہوں میں سے گزر کر نیچے نہیں جا سکتی ۔ دماغ خیالات کی حدود سے پرے نہیں جا سکتا لیکن نہ جسم اور نہ دماغ کے پاس ایسی کوئی طاقت ہے۔ جس سے اپنی ذات کا علم ہو سکے ۔ ہم اُس تشبیہ کے ادراک سے ہی مطمئن ہو جاتے ہیں جس کو غلطی سے ذات سمجھ لیا جاتا ہے ۔

نسیم رضوانی

غزل

بہت مزاجِ محبت سے آشنا ہوں میں
ہنسی بھی آئی ہے لب تک تو رو دیا ہوں میں

مجاز ہوں پہ حقیقت کا مدعا ہوں میں
اسی کی بات بنانے کو بولتا ہوں میں

تجلیوں میں نہاں ہیں تسلیاں بھی کہیں
گلوں میں ذرّوں میں تاروں میں ڈھونڈتا ہوں میں

ستارے گوش بر آوازہ کائنات خموش
کہ جیسے ان سے کوئی راز کہہ رہا ہوں میں

اٹھا اٹھا کے بڑے حشر چپ ہوا ہوں میں
جگا جگا کے زمانہ کو سو چلا ہوں میں

مٹا مٹا کے بساتا ہوں دل کی بستی کو
بنا بنا کے یہ دنیا بگاڑتا ہوں میں

چمک چمک مرے تاریک دل کے گوشوں میں
مہک مہک کے یہ عالم بسا رہا ہوں میں

صبا صبا تری نکہت فروشیاں معروف
یہ کیا یہ کیا ہے کہ بے کیف ہو رہا ہوں میں

خوشا خوشا تری کافر خرامیاں آباد
مٹا مٹا سا تری رہ میں نقشِ پا ہوں میں

چمن چمن تری جلوہ طرازیاں مشہور
سمن سمن تری ندرت کو دیکھتا ہوں میں

بٹھا بٹھا وہ نقوشِ کرم کہ محو نہ ہوں
بجھا بجھا سا دلِ درد آشنا ہوں میں

مچل مچل کے بنایا ہے دل نے دورِ خیال
سنبھل سنبھل کے تجھے یاد کر رہا ہوں میں

قدم قدم ہے تمنا کی سجدہ فرمائی
کرم کرم! ہمہ تن التجا بنا ہوں میں

چھپے چھپے ترے احسان درد تا بحجا
کھلے کھلے ترے الطاف چاہتا ہوں میں

اٹھا اٹھا یہ حجاباتِ آب و رنگ اٹھا
دکھا دکھا وہ تقرب کہ تو ہو یا ہوں میں

ابھر ابھر مری دنیا کے آفتاب ابھر
سنور سنور کہ ترا آئینہ بنا ہوں میں

جہاں جہاں میں ہے افسانۂ وفا مشہور
زباں زباں پہ ہے زیبا کو جانتا ہوں میں

علی حسنین زیبا ردولوی

نواب بہو بیگم

تعارف۔ بہو بیگم نواب شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کی نامور بیوی دہلی کے اُس خاندان میں پیدا ہوئی تھی جس کا خون دودمان شاہی میں مل گیا تھا۔ اور جو اپنی موروثی رفاقت کے سبب سے شاہان مغلیہ کو عزیز تھا۔ ولیم ہوی جس نے معاصر مورخ محمد فیض بخش کی مشہور تصنیف المعروف بہ "تاریخ فرح بخش" کا زبان انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ بہو بیگم کا کیا خوب تعارف کرتا ہے۔

"محمد شاہ کے منہ چڑھے امیر کے گھر پیدا ہوئی۔ ارکان سلطنت کی گود میں پلی حضرت ظل سبحانی کی آغوش میں تربیت پائی۔ اس تزک و احتشام سے بیاہی گئی کہ شاہجہان کے خلف اکبر دارا شکوہ کو چھوڑ کر ہندوستان کے کسی تاجدار کو بھی وہ بات نصیب نہیں ہوئی"۔

بہو بیگم نے اٹھاسی سال کی طویل عمر پائی، جس میں زمانہ کے کیا کیا انقلابات نہیں دیکھے۔ بہادر شاہ سے شاہ عالم تک سلطنت دہلی کا انتزاع دیکھا، صوبہ دار اودھ کی مطلق العنانی اور آخر کار سنہ ۱۸۳۲ء تک نواب وزیر کی خود مختاری اور مرکزی حکومت دہلی سے بے تعلقی دیکھی، سنہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا حملہ دیکھا، اور عروس البلاد دہلی کا تاخت و تاراج ہونا دیکھا بھی نہیں بلکہ بے رحم نادری سپاہ کے ہاتھوں دہلی کی گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہتے دیکھیں، اس کے بعد سنہ ۱۷۶۱ء تک احمد شاہ ابدالی کے تین مسلسل غارتگر حملے دیکھے، اور سب کے آخر میں سلطنت کا وہ چراغ جو بابر نے سنہ ۱۵۲۶ء کے معرکہ سے روشن کیا تھا بجھتے دیکھا۔ بہو بیگم کے عروج کے زمانہ میں اس کے پاس متعدد ہاتھی، بیشمار گھوڑے اور دس ہزار پیادہ اور سوار کی ایک جرار سپاہ تھی، جو اس زمانہ میں ایک اچھی خاصی طاقت متصور کی جاتی تھی۔

خاندان۔ بہو بیگم کا اصلی نام امۃ الزہرا تھا، اور وہ نواب معتمد الدولہ محمد اسحاق خاں کی واحد دختر تھی معتمد الدولہ اسم بامسمی تھا اور محمد شاہ جس کے دربار کے اعیان و امرا میں اس کا شمار تھا اس پر بہت اعتماد کرتا تھا اور تلطف خسروانہ سے پیش آتا تھا معتمد الدولہ دیوان خالصہ یا وزیر خزانۂ عامرہ کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھا۔ دیوان خالصہ وزیر اعظم کے بعد سلطنت کا سب سے بڑا رکن خیال کیا جاتا تھا۔ بہو بیگم کی شادی ابوالمنصور صفدر جنگ بانی فیض آباد کے فرزند شجاع الدولہ کے ساتھ سنہ ۱۷۴۶ء میں ہوئی تھی۔ صفدر جنگ اس زمانہ میں ایک بلند پایہ امیر تھا۔ وہ نہ صرف محمد شاہ کا معتمد تھا بلکہ معتمد الدولہ کا بھی خیر خواہ اور رفیق تھا یہی وجہ تھی کہ باوجودیکہ شجاع الدولہ اور بہو بیگم ہنوز بہت کم سن تھے بادشاہ کی خوشی اور دونوں سمدھیوں کی تمنا

کے مطابق نسبت قرار پا گئی۔ لیکن بدنصیب باپ اپنی دختر کا سہرا نہ دیکھ سکا اور شادی سے پہلے ارمان لئے ہوئے چل لیا۔ نواب نجم الدولہ بیگم کے بڑے بھائی نے مثل اپنی اولاد کے اس کو پالا۔ اور چونکہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی اس وجہ سے اپنی تمام املاک بہو بیگم کو دیدی۔ شادی جو سنہ ۱۱۵۹ھ مطابق سنہ ۱۷۴۶ء میں ہوئی ایک ایسا موقع تھا جس میں ہر دو مستمدین و ارکان سلطنت نے حضرت ظل سبحانی کے زیر عاطفت اپنی دولت و ثروت اور جاہ و جلال کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا۔ امۃ الزہرا کے جہیز میں سب سے معمولی چیز ایک ہزار چاندی کے جام یا پیالے تھے جن میں ہر پیالہ سو روپیہ سے کم کا نہ تھا۔ بہو بیگم نے کئی پرگنوں کی ایک جاگیر بھی پائی تھی۔ جن میں سیلون شامل تھا۔ اور جس کی مجموعی آمدنی اُس وقت تقریبًا نو لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ بہر کیف جہاں تک شادی کا تعلق ہے بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ کم و بیش دو کروڑ روپیہ تمام تقریبات میں صرف ہوا تھا۔ بہو بیگم کی شادی شاہانِ مغلیہ کے آخری عہد کی آخری شوکت کا مظاہرہ تھی۔

بہو بیگم فیض آباد میں ۔ شادی کے بعد بہو بیگم فیض آباد میں اپنے شوہر کے ساتھ رہی۔ اُس کو فیض آباد سے بہت اُنس تھا اور باوجودیکہ ۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کا انتقال ہو چکا تھا، اور اس کے بعد نواب آصف الدولہ نے اپنا دار الحکومت بجائے فیض آباد کے لکھنؤ کر دیا تھا۔ بہو بیگم نے فیض آباد کو خیرباد کہنا گوارا نہیں کیا اور ۱۸۱۶ء میں وہیں انتقال کیا۔ فیض آباد شجاع الدولہ کی توجہ سے بہت آباد اور خوبصورت شہر ہو گیا تھا۔ اور شمالی ہندوستان میں دہلی کے اُجڑے ہوئے شرفا کی امید گاہ بن گیا تھا۔

مسٹر ایچ آر نیول آئی سی۔ ایس لکھتے ہیں:-

"فیض آباد میں ایران، چین اور یورپ کے تجار بھرے ہوئے تھے اور کنچن برس رہا تھا"

بیگم اور شجاع الدولہ ۔ ۱۶ اگست سنہ ۱۷۶۵ء میں شجاع الدولہ اور انگریزوں کے درمیان الہ آباد میں ایک معاہدہ ہوا۔ جس میں علاوہ اور شرائط کے ایک شرط یہ تھی کہ نواب شجاع الدولہ کمپنی کو پچاس لاکھ روپیہ بطورِ تاوانِ جنگ ادا کرے اس وقت نواب کے پاس صرف دس لاکھ روپیہ نقد تھا۔ لیکن بقیہ چالیس لاکھ کہاں سے آتا۔ مصنف سیرۃ المتاخرین لکھتا ہے کہ

"اس بے سروسامانی اور بے دست و پائی کے عالم میں نواب نے اپنے رفقا اور بیگم اور دیگر اعزہ سے روپیہ کی امداد چاہی، اور کہلا بھیجا کہ میری گلو خلاصی تاوان کے ادا کرنے پر منحصر ہے۔ لیکن اس کو بہت جلد تجربہ ہو گیا کہ اس کے ان رفقا نے جو وفاداری کا دم بھرتے تھے روپیہ کو آقا سے عزیز رکھا۔ اور جو مطیع اور اپنے آقا کے احسانمند تھے انہوں نے بمشکل مطلوبہ رقم کا نصف وربع پیش کیا۔ مگر بہو بیگم نواب کی باوفا پہلو نشین اس

موقع پر بڑا کام کر گئی۔ اس نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ حقیقت میں باوفا اور باعفت بیوی سے زیادہ کوئی نعمت نہیں۔ بہو بیگم نے اپنا تمام زر و جواہر حتیٰ کہ اپنی ناک کی کیل بھی بلکہ محل کی تمام عورتوں کا زیور سب شجاع الدولہ کے حضور میں پیش کر دیا جن لوگوں نے بیگم کو منع کیا تھا ان کو اس نے وہ دندان شکن جواب دیا کہ پھر کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے کہا۔

"میرے پاس جو کچھ ہے وہ میرے کام کا اُس وقت تک ہے جب تک میرے شوہر پر کوئی آنچ نہیں پہونچتی لیکن جس وقت خدانخواستہ میرا شوہر نہ رہا اس وقت یہ زر و جواہر میرے کس مصرف کا؟ کیا وہ اس کے بعد بھی کام آسکتا ہے؟"

کپتان جے بیلی رزیڈنٹ لکھنؤ اپنے ایک مراسلہ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۸۱۳ء میں جو لیوڈ کے نام تحریر کیا گیا ہے نواب بہو بیگم کی اس گرانقدر مدد کا تذکرہ کرتا ہے۔ دوسرا خط لارڈ کلایو کا ہے۔ اس میں بھی بیگم کا ذکر ہے۔

بیگم کا اثر نواب پر۔ نواب شجاع الدولہ نے بیگم کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ اور اس دن سے اس کے دل میں بہو بیگم کی عزت بہت زیادہ ہو گئی۔ اور اس کی وفاداری کی بہت قدر کرنے لگا۔ بیگم نواب کی اس قدر معتمد ہو گئی تھی کہ جو روپیہ اس کے ہاتھ میں آتا یا تحائف پیش کئے جاتے سب براہ راست محل میں بیگم کے پاس جاتے۔ آخر میں سلطنت کی مہریں بھی بیگم کے پاس رہنے لگی تھیں۔ نواب نے ضلع گونڈہ میں بیگم کو مزید وسیع جاگیریں عطا کی تھیں۔ اب تو نواب پر بیگم کا اس قدر اثر ہو گیا تھا کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ اُس کے سامنے دوسرے محلات یا سوائے بیگم کے فرزند نواب آصف الدولہ کے کسی اور لڑکے کا نام لیتا۔ اپنے عصر میں بہو بیگم ہی ایک ایسی خاتون ہے جس کی ہمسر سلطنتِ دہلی کے تیئیس ۲۳ صوبوں میں باعتبار وقار، وجاہت اور شان و شوکت کے کوئی عورت نہ تھی۔

شجاع الدولہ کے بعد۔ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد نواب آصف الدولہ مسندِ حکومت پر متمکن ہوئے اور ۱۷۷۵ء سے ۱۷۹۷ء تک سریر آرا رہے۔ آصف الدولہ ماں سے کچھ آزردہ ہو گئے تھے، اور فیض آباد کو ترک کر کے لکھنؤ کو دار الحکومت قرار دیدیا تھا ۱۷۹۵ء میں انہوں نے بھی داغِ مفارقت دے کر رحلت کی اور ان کے بعد ان کا متبنیٰ وزیر علی صرف چار ماہ حکمرانی کر کے چل بسا۔ اب یمین الدولہ سعادت علی خاں بہو بیگم کا سوتیلا لڑکا تخت پر بیٹھا۔ بیگم اور سعادت علی خاں میں تعلقات ہمیشہ سے خراب تھے۔ اور اب آ اس کے برسر حکومت ہونے سے بیگم کو اپنی جان تک کا خدشہ ہو گیا تھا۔

اسی موقع پر وہ انگریزوں سے مدد کی خواستگار ہوتی ہے۔ اور آخرکار ریزیڈنٹ نواب اور بیگم کے درمیان ایک

معاہدہ ہوتا ہے جس میں سعادت علی خاں بیگم کو کافی اعزاز کرنے اور اس کو ہر طرح کی آسائش پہنچانے کا وعدہ کرتا ہے۔ انگریز نواب کی طرف سے ضمانت کرتے ہیں۔ اس معاہدہ ہی کے رو سے بیگم کو اور جاگیر ملتی ہے۔ لیکن تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سب ظاہرداری تھی۔ اور درحقیقت سعادت علیخاں کی نظر ہمیشہ بیگم کی کثیر املاک اور گراں بہا جواہر پر لگی رہی۔ اور وہ تاک میں لگا رہا کہ کوئی موقع ملے اور سب پر قبضہ کر لوں۔ مزید براں اس نے اور بہت سے کام ایسے کئے جس سے بیگم کے دل میں اس کی طرف سے کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔ بیگم کے بھتیجے بندہ علی خاں کی جاگیر ضبط کر لی گئی۔ فیض آباد میں حفاظت کے بہانے سے سپاہ تعینات کر دی گئی۔ اس کے باورچی خانہ کے خرچ میں چار سو روپے یومیہ کی بجائے صرف دو سو روپے کر دیئے گئے۔ اور سب پر طرہ یہ کہ جو اعزازات شجاع الدولہ کے عہد میں بیگم کو حاصل تھے وہ موجودہ نواب نے اس کی سوت یعنی اپنی ماں کو دیدیئے۔

بیگم اور کمپنی۔ اس طرز عمل کو ناقابل برداشت خیال کر کے آخر کار بیگم نے تقریباً اواخر ۱۷۹۹ء میں ایک خط مارکوئس آف ولزلی گورنر جنرل کے نام لکھا جس میں اس امر کی استدعا کی گئی تھی کہ وہ رزیڈنٹ لکھنؤ کو اس امر کی ہدایت کر دے کہ کوئی اپنا یا پرایا بیگم کے خانگی معاملات میں دخیل نہ ہونے دیا جائے۔ مسٹر لمسڈن اس زمانہ میں رزیڈنٹ تھا۔ بیگم اتفاق سے لکھنؤ گئی ہوئی تھی۔ اس نے لمسڈن کو طلب کیا اور خود بنفس نفیس رزیڈنٹ سے تنہائی میں گفتگو کی، لیکن اس موقع پر بھی اس کا معتمد رفیق جواہر علی خاں موجود تھا۔ بہو بیگم کی اس جسارت پر سعادت علی خاں کانپ اٹھا۔ لیکن وہ بڑا عقلمند تھا۔ اپنے خوف کا اظہار تو نہ ہونے دیا بلکہ بیگم سے کہلا بھیجا کہ "میں آپ کی دیدہ دلیری پر شرم سے پانی پانی ہوا جاتا ہوں۔ آپ نے بھی غضب کیا حضرت جنت آشیاں (شجاع الدولہ) اور فردوس مکانی برادر معظم (نواب آصف الدولہ) کی حیات میں کسی نے آپ کی آواز تک نہیں سنی۔ اب آپ پر خدانخواستہ کیا مصیبت آئی کہ آپ نے رزیڈنٹ سے باتیں کیں"۔ بہو بیگم نے دنداں شکن جواب دیا:

"یہ دن صرف تمہاری تخت نشینی سے دیکھنا پڑا۔ دیکھئے قسمت اور کیا کیا دکھاتی ہے اور کتنی بار ہنوز ہمیں غیروں سے پھر بات کرنے پر مجبور کرتی ہیں؟۔ مجھے اپنے قول و فعل کا اختیار ہے تم کو میرے افعال سے کوئی سروکار نہیں"

وصیت نامہ۔ بیگم نے لمسڈن سے اپنی تمام املاک کے متعلق ایک وصیت نامہ تحریر کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا اور کہا تھا کہ اس کا نفاذ انگریزوں کے ذریعہ سے ہو۔ لمسڈن نے بیگم کی اس خواہش کو گورنر جنرل کے پاس لکھ کر [illegible] منقولہ و غیر منقولہ کی

فہرست لکھ کر اور اپنی مہر ثبت کر کے بھیجیں تو اس پر کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ بہو بیگم نے آخر کار ۱۲ ربیع الاول ۱۲۲۵ھ کو وصیت نامہ لکھا اور کپتان بیلی کے پاس بھیجدیا۔ لیکن ہوشیاری یہ کی کہ فہرستِ جائداد نہ بھیجی۔ دو سال تک یہ وصیت نامہ بیلی کے پاس پڑا رہا لیکن ۱۸۱۳ء میں جب بیگم کی طبیعت ناساز ہوئی تو بیلی نے لارڈ منٹو کو جو اس زمانہ میں گورنر جنرل تھے وصیت نامہ بھیج دیا۔ لارڈ منٹو نے ریزیڈنٹ کو ہدایت کی کہ فوراً بیگم سے ملو اور کہو کہ جب تک آپ فہرستِ جائداد نہ مرتب کرینگی وصیت نامہ کا نفاذ ناممکن ہے۔ بیگم کو اپنی حیات میں فہرست ترتیب دیکر اپنے ہاتھ کٹوا دینا یا جائداد کو غیروں کے حوالے کر دینا بہت شاق تھا۔ تاہم بیل تو کسی نہ کسی طرح منڈھے چڑھنی تھی۔ چار ناچار پہلی وصیت کو منسوخ کر کے ایک دوسری مکمل دستاویز جس میں تفصیل جائداد شامل تھی ۲۶ رجب ۱۲۲۸ھ مطابق ۲۵ جولائی ۱۸۱۳ء کو تحریر کی گئی۔ اس دستاویز کے رو سے تمام املاک بیگم کی وفات کے بعد کمپنی کے سپرد کی گئی تھی۔ اور جائداد کی آمدنی سے خیرات، امورِ دینی کی انجام دہی و نیز اعزہ و اقربا کو وظائف کی تقسیم کمپنی کے زیرِ نگرانی قرار دی گئی تھی۔ ۲۹ اکتوبر ۱۸۱۳ء کو انگریزوں نے بھی ایک دستاویز بطور اقرار نامہ کے تحریر کر دی جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ وصیت کے رو سے جو فرائض کمپنی پر عائد ہوتے تھے وہ موصیہ کے منشا کے مطابق انجام دیئے جائیں گے اور کمپنی جائداد اور اُس کی آمدنی کی امین رہے گی۔

بہو بیگم کا وصیت نامہ تاریخ اودھ کا ایک مستقل باب ہے۔ نواب زادہ اے۔ الیف۔ ایم عبد العلی کیپر انڈین ریکارڈ وغیرہ وغیرہ کلکتہ نے اپنے مطبوعہ مضمون بعنوان "بہو بیگم کا آخری وصیت نامہ" میں شرائطِ وصیت و تفصیل جائداد پہ بحث کی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل زیادہ دلچسپ نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ وصیت کے رو سے دو لاکھ چھیانوے ہزار نو سو چھہتر روپیہ سالانہ کے وظائف مقرر کئے گئے تھے۔ اور تین لاکھ مقبرے اور ایک لاکھ مشاہدِ مقدسہ کے لئے رکھے گئے تھے۔

۸۹۴۸۹۱۶

بہو بیگم نے علاوہ جواہرات نواسی لاکھ اڑتالیس ہزار نو سو سولہ روپے خزانے میں چھوڑے تھے۔ جائداد و املاک کو جو جاگیروں پر مشتمل تھی اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ وظائف ہزاروں روپیہ سالانہ کی تعداد میں "بہو بیگم کا وثیقہ" کے نام سے وقف حسین آباد مبارک لکھنؤ کی زیرِ نگرانی اب بھی تقسیم ہوتے ہیں۔

شکل و شمائل لباس و وضع۔ بہو بیگم اپنے عہد کی حسین ترین عورتوں میں تھی۔ یہ بات اب تک مشہور ہے کہ شجاع الدولہ کے محلات میں کوئی عورت حسن میں اس سے ہمسری نہ کر سکتی تھی۔ میں نے لکھنؤ اور کلکتہ کے عجائب خانوں اور وکٹوریہ میموریل ہال میں بہو بیگم کی تصویر بہت تلاش کی۔ اس واسطے نہیں کہ اگر وہ آج دستیاب ہو گئی ہوتی تو

اس کو اس مضمون کے سرورق کی زیب و زینت قرار دینے کی کوشش کی جاتی۔ بلکہ تصویر دیکھنے کے بعد اس کے شکل و شمائل پر موثق معلومات پیش کی جاسکتیں۔ ممکن ہے کہ کہیں کوئی قلمی تصویر ہو لیکن مجھکو نہیں ملی۔ بہر کیف اس قدر ضرور قابلِ اعتبار ہے کہ وہ حسین تھی اور انتہائی جامہ زیب بھی واقع ہوئی تھی۔

اس زمانہ میں دہلی اور لکھنؤ کی بیگموں کا پہناوا بڑے پائچوں کا کلیوں دار پائجامہ، اتنے بڑے پائچے کہ دو پائچہ بردار عورتیں ان کو لے کر چلتی تھیں، انگیا کرتی اور دوپٹہ تھا۔ دہلی میں تو یہ لباس متروک ہوگیا اور پائجامے کی جگہ پنجابیت کے اثر سے شلوار اور لانبے کرتے نے لے لی۔ لیکن لکھنؤ میں شاہی خاندان کی بیگموں میں یہ وضعداری میں داخل ہے۔ رفتہ رفتہ ساری اور بلوز پائجامہ اور کرتی کو نظروں سے گرانے جاتے ہیں۔

کیرکٹر۔ وہ صداقت پسند، دلیر، حلیم الطبع، سخی اور مستقل مزاج تھی۔ اور آڑے وقتوں میں ہوش و حواس قابو رکھتی تھی۔ وہ شریف نواز تھی۔ زندگی میں سیکڑوں نہیں ہزاروں صاحبان حاجت شرفا اس کے دم سے پلتے تھے۔ مرنے کے بعد اپنی غیر فانی وصیت سے بیشمار شریف خاندانوں کی دستگیری کرگئی۔ وہ اگلے زمانہ کی وفاشعار بیوی تھی اور "مشرقی شریکِ زندگی" کی حیثیت سے جو باتیں اس کو مغربی عورتوں سے ممتاز کرتی ہیں وہ سب اس میں موجود تھیں۔ شوہر کے لئے ہر طرح کی قربانی اور ایثار اپنا شعار سمجھتی تھی۔ معاہدہ الہ آباد کے موقع پر جس حوصلہ مندی سے اس نے اپنے تمام زر و جواہر کو شجاع الدولہ کے قدموں پر رکھ دیا وہ نہ صرف ایک باوفا باعصمت بیوی کی رفاقت کی مثال ہے بلکہ اس امر کا بھی ثبوت ہے کہ اس کو شجاع الدولہ سے بہت محبت تھی۔

وہ متین و سنجیدہ تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے سامنے آواز سے ہنسے یا کوئی بدتمیزی کرے۔ وہ قدرشناس تھی، جن رفقا نے اس کے ساتھ وفاداری کی تھی ان کے ساتھ نہ صرف اپنی زندگی میں وہ سلوک کرتی رہی بلکہ مرنے کے بعد بھی اپنی وصیت میں ان کی آنے والی نسلوں کی پرورش کا انتظام کرگئی۔

وہ امامیہ اثنا عشریہ مذہب رکھتی تھی اور اپنے عقائد میں بہت پختہ تھی۔ وصیت نامہ کے رو سے ایک لاکھ روپیہ مشاہد مقدسہ کے لئے بھی دیا گیا ہے۔

وہ شفیق ماں تھی۔ چنانچہ جب نواب آصف الدولہ نے ماں سے خفا ہوکر اور فیض آباد کو ترک کرکے لکھنؤ بسایا تو بیگم نے بیٹے کی آزادگی پر چشم پوشی کی اور اپنی مادرانہ شفقتوں کو مسلسل جاری رکھا۔

مرض الموت اور وفات۔ صاحب "تاریخ فرح بخش" نے بہو بیگم کی وفات کو شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ میرے خیال میں جہاں تک بہو بیگم کے واقعات کا تعلق ہے کوئی تذکرہ "فرح بخش" سے زیادہ موثق اس وقت

موجود نہیں ہے۔

سنہ ۱۸۱۵ء میں اس کی عمر ۸۸ سال کی ہو چکی تھی۔ سن اور آخر عمر کے پیہم صدمات نے اس کی کمر کو دو نیم کر دیا تھا، وہ روز بروز نحیف و ناتواں ہوتی جاتی تھی، اور محض اپنی ہٹ سے نقل و حرکت کرتی تھی۔ ہر سال وہ محرم کے مراسم ادا کرنے اپنے بھتیجے کے ہاں جایا کرتی تھی، اور بعدِ عشرہ واپس آتی تھی۔ اس مرتبہ بھی جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لیکن داراب علی خاں نے موسم کی خرابی اور کیفیتِ مزاج کو دیکھتے ہوئے بصد عجز بیگم کو منع کیا۔ لیکن وہ کب کسی کی سنتی تھی۔ جب کبھی کسی امر کا ارادہ کر لیتی تھی تو دنیا کی کوئی طاقت اُس کو مانع نہ ہو سکتی تھی، بہو بیگم نے ایام عزا ختم کئے اور واپس آئی۔ لیکن راہ میں انتہائی سردی کے سبب سے نزلہ و زکام ہو گیا۔ اور خفیف سی حرارت بھی معلوم ہونے لگی۔ تدارک شروع ہو گیا لیکن رفتہ رفتہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ مرنے سے ایک دن پہلے اس نے شجاع الدولہ کو خواب میں دیکھا کہ نواب اس کو لینے آئے ہیں۔ اُس نے یہ خواب داراب[1] علی خاں سے بیان کیا، اور اس کے بعد ہزاروں رفقا و وابستگان کے نالہ و شیون، آہ و زاری میں روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ رہے نام اللہ کا!

محاکمہ۔ یہ تھی اٹھارویں صدی کے اواخر اور اُنیسویں صدی کے اوائل کی سب سے زیادہ شاندار ہندوستانی خاتون کی سرگذشت، سلطنتِ دہلی کا شان و شکوہ، جاہ و جلال ہنوز باقی تھا۔ لیکن بقول نواب زادہ اے ایف ایم عبد العلی

"اپنے عصر میں بہو بیگم ہی ایک ایسی خاتون ہے جس کی ہمسر سلطنتِ دہلی کے تیئیس صوبوں میں باعتبار وقار و وجاہت کے کوئی عورت نہ تھی"

شہنشاہ حسین (رضوی)

---

[1] داراب علی خان بیگم کا معتمد ترین رفیق تھا۔ اور اس کو سیاہ و سفید کے کُل اختیارات حاصل تھے۔

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام دانی کہ چیست؟
یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے

(۱)

یک چمن گل

غزل کے سوز سے جادو جگائے ہیں میں نے
فروغِ شعر سے دل جگمگائے ہیں میں نے

بہت فریبِ محبت کے کھائے ہیں میں نے
نصیب اپنے بہت آزمائے ہیں میں نے

یہ کہہ کے مجھ کو بلاتا ہے چاند اپنی طرف
کہ تیری راہ میں تارے بچھائے ہیں میں نے

تمہارے عشق کی بازی سنبھالنے کے لئے
ہزار طرح کے نقشے جمائے ہیں میں نے

مری وفا کے فسانے ہیں درد سے لبریز
یہ گیت جوگ کی دُھن میں سنائے ہیں میں نے

کسی حسین بتِ کافرہ کی الفت میں
سوانگ کفر کے اکثر رچائے ہیں میں نے

صنمکدوں میں گیا ہوں بصد نیاز و گداز
چراغ رات کو جا کر جلائے ہیں میں نے

لباس اپنے رنگائے ہیں صندلی اکثر
جبیں پہ راکھ سے ٹیکے لگائے ہیں میں نے

مجھے وفا کے سلیقے سکھائے ہیں تم نے
تمہیں جفا کے طریقے بتائے ہیں میں نے

ہر ایک چیز لرزنے لگی ہے دنیا کی
کہ سازِ عشق کے پردے ہلائے ہیں میں نے

نہ پوچھ میری امیدوں کا تو نشیب و فراز بنا بنا کے یہ نقشے مٹائے ہیں میں نے

بٹھا کے اس گلِ رعنا کو سامنے عابد

رخِ بہار سے پردے اٹھائے ہیں میں نے

(۲)

یک نیستاں نالہ

بڑا کرم ہے کہ ذوقِ نظر دیا تو نے! یہ چیز بخش کے برباد کر دیا تو نے!!

بنا کے حسن کی رنگیں بہار کو فانی رگِ جنوں کے لئے نیشتر دیا تو نے

ترے کرم کی کوئی حد نہیں رہی باقی کہ سر کے ساتھ مجھے دردِ سر دیا تو نے

گل و سمن سے رہا بے نیاز دل میرا بہار آئی تو داغِ جگر دیا تو نے

گلہ ہے تلخ نوائی کا مجھ سے دنیا کو

مری زبان میں کیسا اثر دیا تو نے

یک خمخانہ مے

غمِ حیات کو شاداب کر لیا میں نے کہ دل کو عشق سے بے تاب کر لیا میں نے

مری رگوں میں وہ زہرِ جنوں ہے شعلہ فروز جسے حریفِ مئے ناب کر لیا میں نے

بہارِ خونِ تمنا کی آبیاری سے نہالِ عشق کو شاداب کر لیا میں نے

بلائے دردِ محبت خرید کر عابد

محیطِ درد کو پایاب کر لیا میں نے

عابد لاہوری!

محبّت کا ایثار

ایک سچّی کہانی

میرا دوست سہیل یمن کے مشہور قبیلہ بنی عدنان کا ہونہار نوجوان اور اُن تمام خصوصیات و محاسن کا امین اور نمونہ ہے جو عربوں کے قومی خصائص و محاسن اور عربی تہذیب کا سرمایۂ افتخار سمجھے جاتے ہیں۔ وہ حسین و جمیل ہے۔ متواضع و وضعدار، بزرگوں کا ادب، آزادیٔ رائے، آزادیٔ فکر اس کی طبیعتِ ثانیہ ہیں۔ کرم وجود اور ایثار و قربانی وغیرہ اخلاق اس کے حسنِ صبیح کے خدوخال ہیں۔ وہ احتیاج کی حالت میں جھکنا اور غنا کی حالت میں اکڑنا کھنچنا دونوں سے بیگانہ ہے۔ وہ پاسِ دوستی میں ضرب المثل اور مصیبتوں اور مشکلات میں پہاڑ کی طرح مستقیم الحال انسان ہے۔ وہ تبر کی طرح سیدھا اور دوشیزہ کی تر و تازہ و دلکش، شیر کی طرح مشہور و شجاع اور کبوتر کی طرح بے آزار ہے۔ اس کی یہی ادائیں ہیں جن کے باعث میں اس کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہو گیا ہوں۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں، جنہیں غزالی کہا جاتا ہے۔

عربی سہیل کے قبیلے کی زبان ہے۔ لیکن ہندوستان کی آب و ہوا میں پرورش پانے کے باعث گو زبان میں یمنیوں کی سی طراری نہیں رکھتا، پھر بھی عربی زبان اس کی زبان ہے کہ یہ باپ دادا کا ورثہ ہے، وہ اسے کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ ہاں اس کے اس زبان میں کمال حاصل کرنے کے لئے قدرتی سامان یہ ہو گیا کہ پہلے تو والدین کے اصرار سے پھر اپنے ذوق سے سہیل نے کالج میں اپنی زبان زبانِ ثانوی کی حیثیت سے پڑھی۔ امتحان میں اوّل رہا۔ یونیورسٹی سے وظیفہ لے کر یورپ گیا کہ وہاں جا کر یورپ کے عجمیوں سے اپنی زبانِ عربی میں فضیلت کی سند لائے، اور اس سند کی بنا پر اندھی دنیا کو دکھائے کہ گو میں عرب ہوں اباً عن جدٍ مگر یورپ کے صاحبِ سطوت و حکومت بے زبان زباں دان میری زباں دانی کے معترف نہیں تھے اور اب ہیں۔

سہیل جب ہندوستان سے یورپ گیا میرا دوست تھا اور مجھ سے مل کر گیا تھا اور میں اس کے محبّوں کے مجمع میں جو اُسے الوداع کہنے کے لئے سمندر کے کنارے موجود تھا حاضر تھا۔ اور اب جب سہیل ان کامیابیوں کے ساتھ واپس آ رہا تھا تو میں اُس کے استقبال کرنے والوں میں شریک تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ سہیل کی محبّت، سہیل کے خلوص اور سہیل کے صفائے قلب میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ ہاں اگر کوئی تبدیلی تھی تو وہ تبدیلی اُس کی ظاہری وضع و قطع میں تھی جو انسان شناس ہیں،

اِس تبدیلِ ہیئت پر اس کی انسانیت کے اور گرویدہ ہوگئے۔ اور وہ لوگ جو محض لباس شناس تھے اس تبدیلِ وضع پر چیں بجبیں ہوگئے۔ یہ وہ بات ہے کہ جس پر ہم بحث کرنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ یہ باتیں ذوق سے تعلق رکھتی ہیں اور ذوق ہمیشہ لوگوں کے مختلف رہے ہیں۔

غرض سہیل کو لوگوں نے عربی کا عالم، انگریزی کا عالم، فرانسیسی کا عالم، جرمن کا عالم، فارسی کا عالم اور ان زبانوں میں سے بعض زبانوں اور ان کے علوم میں ڈاکٹر کی حیثیت سے دیکھا اور سراہا۔ اور سب کے سب اس کے علمی تبحر میں رطب اللسان نظر آئے۔ مگر ان حیثیات کے علاوہ سہیل کی ایک اور حیثیت بھی تھی جو گو اوروں سے پوشیدہ تھی مگر میرے لئے آئینہ وار تھی۔ میں نے سہیل کو اس رنگ میں بھی دیکھا۔ یا یوں کہیئے کہ سہیل ہی نے مجھے موقع دیا کہ اسے اس شان میں دیکھ لوں۔ گو وہ اوروں سے پوشیدہ رہنا نہ چاہتا تھا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اکثر دوسرے لوگ اس کے حسیاتِ لطیفہ کے ادراک سے محروم تھے۔ اور میں خود چاہے ان سے بہرہ ور ہوں یا نہ ہوں لیکن محروم نہیں۔

سہیل نے یورپ میں کیا کیا؟ کس طرح زندگی بسر کی؟ کن کن لوگوں اور کیسی کیسی سوسائیٹیوں میں وہ رہا؟۔ آپ اس اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس نے ہر ملک کی خصوصیات، ہر ملک والے کے دماغی اور جسمانی اور اخلاقی و معاشرتی کمالات و نقائص پر وہ وہ نکتے مجھ سے بیان کئے کہ مجھے ہندوستان میں بیٹھکر ایسا محسوس ہونے لگا کہ گویا میں بھی اس کے ساتھ ان بہشت زاروں کی سیر کر چکا ہوں۔

ایک دن، عورت، حُسن محبت و عشق، وفا، معاشرت کے قوانین اور ادب کے مسائل پر بحث چھڑ گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہم دونوں سرمایہ اور سیاست کی بحثوں سے اُکتا چکے تھے۔ یہی موقع تھا کہ سہیل نے اپنی یورپی زندگی کا ایک خاص ورق میرے سامنے رکھ دیا۔ اب میں اس ورق کو اُسی کی زبان میں اپنے ناظرین کے سامنے رکھتا ہوں۔ کیونکہ میرا عقیدہ یہی ہے کہ اپنی کہانی کچھ اپنی زبانی ہی اچھی طرح بیان ہوسکتی ہے۔ سنئے سہیل نے یوں کہا۔

میں ہندوستان سے علمی تحقیقات کے لئے انگلستان گیا تھا، اور جاتے ہی اپنے علمی کام میں مصروف ہوگیا۔ کچھ مدت کے بعد اسی علمی تحقیق و تفتیش کے سلسلہ میں جرمنی بھی جانا پڑا۔ اور جرمنی کے دارالسلطنت برلن میں مقیم ہوا۔ وہاں کے مستشرق علماء سے ملا۔ ان علما میں ایک ایک اپنے فن میں ایسا شخص ہے جس نے مشرق کی ایک ایک بات کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ ان میں جو عربی کے پروفیسر ہیں اُن کے متعلق یہ کہنا کافی نہ ہوگا کہ وہ عربی جانتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ عربی میں فنا ہیں۔ اور عربی جاننے والوں میں ایسے بھی ہیں جو ثانوی حیثیت سے انگریزی سے بھی فی الجملہ واقف ہیں، اور یہ دونوں زبانیں میری زبانیں ہیں۔ تاہم ان فاضلوں کے فضل و کمال سے خوشہ چینی کے لئے ضرورت تھی کہ میں خود بھی عربی زبان سیکھوں جو آج ساری

مغربی زبانوں میں اہم اور مشرقی و مغربی خزائنِ علوم کی کلید زبان ہے۔ اس لئے میں نے ایسے وسائل اختیار کئے جن سے میں تھوڑی مدت میں زیادہ سے زیادہ کام کر سکوں اور زیادہ سے زیادہ جرمن زبان کے علوم حاصل کر سکوں۔

اسی سلسلہ میں مجھے برلن کے میوزیم میں روزانہ جانا ہوتا تھا۔ جہاں عربی زبان اور عربوں کے متعلق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ عربوں کا اور جرمن علما کا فراہم کیا ہوا بے نظیر سرمایہ اور ذخیرہ موجود تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک طالب علم کی معشوق تو کتاب ہوا کرتی ہے مگر آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ بعض اوقات علمی خوراک، کاغذی کتابوں کے علاوہ انسانی صورت کی کتابوں میں میسر آجایا کرتی ہے۔ علم کے شیدا مرد ہی ہو سکتے ہیں یا ہونا چاہئیں، یہ مسئلہ ہماری سمجھ میں تو کبھی آیا نہیں یا یہ خیال کہ علم مردوں ہی کا ورثہ ہے ایک بچوں کا سا خیال ہے اس لئے برلن میوزیم میں مختلف اقوام کی دونوں صنفوں کے طالب علموں کا اچھا خاصا مجمع رہا کرتا تھا جن کی زبانیں خاموش اور آوازِ پا گم پس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسان نہیں موم کی ڈھلی ہوئی مورتیاں ہیں جو مختلف میزوں پر بٹھا دی گئی ہیں۔ اور وہی پتلیاں ہیں جو حرکت کر رہی ہیں۔

برلن میں جاتے ہی میری ملاقات ایک اور عرب نوجوان سے ہو گئی تھی کہ وہ بھی وہاں فضیلت علمی (ڈاکٹریٹ) کی ڈگری کے لئے آیا ہوا تھا۔ غیر ملک میں دو ہم قوموں، ہم زبانوں اور ہم مذاقوں کا جنگل بیابان میں پیاسے کو میٹھے ٹھنڈے پانی سے زیادہ خوشگوار اور ایک گمراہ کو خدائے مجسم کے ملنے کے مرادف ہوا کرتا ہے۔ باہمی ملاقات کچھ ایسی ہی حالت ہم دونوں کی بھی ہوئی۔ وہ نوجوان عرب شام کا رہنے والا، عرب کے ایک مشہور امیر، ادیب، عالم اور اہلِ قلم بزرگ کا بھتیجا تھا۔ نوجوان تھا۔ میری طرح، مگر علم میں پختہ، رائے میں پختہ، فہم و فراست میں پختہ اور معاملات میں سلجھا ہوا تھا۔ اخلاق میں انسانیت کا نمونہ، حسن میں کیوپڈ مگر دانا اور بینا۔ اس کو مجھ میں اور مجھ کو اس میں کچھ ایسی خوبیاں نظر آئیں کہ ہم دونوں میں شناسائی سے دوستی و یگانگت و محبت قائم ہو گئی۔ ہم ایک ساتھ رہتے ایک ساتھ کھاتے پیتے کام کرتے اور ایک ساتھ برلن میوزیم میں جایا کرتے تھے، جہاں ہم دونوں اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ہم ایک میز پر بیٹھتے تھے لیکن ایک دوسرے سے کسی قدر فاصلہ پر۔

میز کے جس حصہ پر میرا یہ دوست بیٹھا کرتا تھا اس کے عین بالمقابل ایک جرمن لڑکی بھی جو نوجوان تھی اور علم کی پروانہ بیٹھا کرتی تھی۔ یہ کچھ قاعدہ سا ہی ہو گیا تھا کہ ہر روز دونوں کی نشست ایک ہی جگہ ایک ایسے انداز سے ہوا کرتی تھی جیسے پہلے پہل تو میں نے دیکھا نہیں، مگر جب میرے عرب دوست کی حرکات سے بزبانِ حال یہ فریاد بلند ہونے لگی کہ۔

دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدارا — دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

تو میری توجہ بھی اُدھر منعطف ہوئی۔ اب میرا عرب دوست صرف طالب علم ہی نہ تھا، بلکہ امیر تھا اور نوجوان، امیر مگر مہذب اور زیور

علم سے آراستہ و پیراستہ نوجوان طالب علم۔ ان سب حیثیات نے رنگ دکھایا۔ وہ یوں بھی ہر روز عمدہ لباس اپنی شانِ امارت کے مطابق پہنا ہی کرتا تھا مگر اب تو لباس میں تراش و خراش، بناؤ چناؤ، رکھ رکھاؤ کا اتنا اہتمام ہونے لگا کہ جو اس کو دربارِ حسن میں باریابی کے لیئے ضروری معلوم ہوتا تھا۔ اس کی نشست تو اس لڑکی کے سامنے ہوتی ہی تھی۔ مگر اب اس کی نشست کے پہلو اور انداز بدلے جانے لگے۔ اس کی نگاہیں کتاب اور کاغذ سے زیادہ کسی کے مصحفِ رخسار کے مطالعہ میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ وہ ہر ممکن کوشش سے چاہا کرتا تھا کہ وہ لڑکی جس کا جرمن نام خواہ کچھ بھی ہو مگر ہم لوگ بعد میں ہمیشہ اُسے "غزال" ہی کے نام سے مخاطب کیا کرتے تھے اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ اُس نے کبھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ کبھی اس سے بات نہیں کی۔ یہ تو بڑی باتیں ہیں انتہا یہ کہ اُس نے کبھی میرے دوست کو اپنی طرف ملتفت ہونے کا موقع بھی نہ دیا تھا۔ میرے عرب دوست کی دنیا میں زلزلہ برپا تھا۔ مگر غزال پورے سکون کے ساتھ اسکے سامنے بیٹھی رہا کرتی تھی۔ شاید وجہ یہی تھی کہ غزال آنکھوں کی راہ سے آنے والے تیروں سے بے خبر تھی۔ مگر میں دور بیٹھا بیٹھا اپنے تیرانداز کی ناکامیوں پر کُڑھا کرتا اور غزال کی بے حسی اور بے التفاتی اور برودتِ قلب پر حیران رہا کرتا تھا۔

میرے لیئے یہ مسئلہ انسانی سرشت کا اہم مسئلہ تھا جس میں ایک گونہ مجھے دلچسپی تھی۔ میرے عرب دوست کا شوق روز بروز بڑھتا جا رہا تھا، مگر اس کی یہ تمام افتادگیاں اور نیازمندیاں سرکارِ حسن میں نامقبول تھیں۔ کیونکہ غزال کے جمود و بیگانگی میں قطعاً کوئی فرق نہ آیا اور نہ آتا ہی نظر آتا تھا۔ میں حیران تھا کہ آخر اس عرب نوجوان کی محبت اور اس مغربی غزال کی مشرقی بیگانگی کا حشر کیا ہونے والا ہے۔ غزال کو تو یوں بھی بے بصر نہ ہونا چاہیئے مگر پھر بھی عرب کی حالت غزال کی نگاہ سے اسی طرح پوشیدہ تھی جس طرح چاند کی اٹھائیسویں کو چاند آسمان کے مطلع سے غائب اور پوشیدہ ہوتا ہے۔

یقین مانیئے کہ میرے عرب رفیق کی اس بے دست و پائی اور بے چارگی یا عشقِ پُرجوش کی اس بے اثری پر مجھے رحم آتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس بارے میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ وہ کیوپڈ تھا اور تھا بھی آنکھوں والا۔ کیا یہ تماشہ نہیں کہ یونان کا اندھا کیوپڈ تیر مارتا تھا اور وہ نشانے پر بیٹھا کرتا تھا، مگر یہ میرا عرب کیوپڈ دیکھ دیکھ کر اور شست باندھ باندھ کر تیر مارتا تھا لیکن اس کے سب کے سب تیر خطا جاتے تھے۔

ایک دن غزال حسبِ معمول لکھنے میں مصروف تھی۔ لکھتے لکھتے اُس کے قلم نے چلنے سے جواب دیدیا، کہ قلم کا خزانہ روشنائی سے خالی ہو چکا تھا۔ آپ جانتے ہیں لکھنے والے کا قلم اگر عین جوشِ تحریر کے عالم میں بے کار ہو جائے تو لکھنے والے کی کیا حالت ہوا کرتی ہے۔ اُس کے خیالات کس طرح بکھر جاتے ہیں آپ اس سے بھی بے خبر نہیں۔ یہی حالت اس غریب کی بھی ہوئی۔ اُس نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے میرا عرب رفیق بیٹھا تھا۔ مگر کس طرح! کہ خود بخود پہلے ہی سے دینے کے لیئے اپنا قلم لئے

میں سے پیش کرنے کو آمادہ تھا۔ وہ اُٹھا یہ کہتا ہوا: "مادام کیا میں اپنا قلم آپ کی خدمت میں پیش کرسکتا ہوں"۔ لکھنے والے کا قلم بے کار ہوجائے، اور اس کا محبوب کام یوں بے دردی سے ادھورا رہ جائے ایسی حالت میں اگر اُسے بے طلب خود بخود قلم مل جائے تو اُس کی قدر و قیمت کسی امتحان میں بیٹھے ہوئے محنتی طالب علم یا کسی ایسے شخص سے پوچھئے جو کسی اہم تحریر میں مشغول ہو چنانچہ غزال نے بھی اس کو غنیمت سمجھا، اس نے قلم لے لیا، شکریہ کے ساتھ۔ تحریر کا بقیہ کام پورا کیا اور واپس دے دیا، شکریہ کے ساتھ۔

میرے عرب دوست کا خیال یہ تھا کہ یہ ابتدائے مرغوب انتہائے مطلوب کا پیش خیمہ ثابت ہوگی، مگر ہوا یہ کہ ہفتوں بعد تک کوئی ایسی بات نہ ہوئی کہ "غزال" اور اُس کی اجنبیت کے حجابات اُٹھ جاتے یا اقلاً کم ہی ہوجاتے۔ میرے دوست کی نیازمندیوں میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ مگر غزال کی اجنبیت میں بھی فرق نہ آنا تھا نہ آیا۔ میں حُسن و عشق کے کھیل کو دیکھ رہا تھا اور حیران تھا۔ عرب کی پیکاں افگنی جاری تھی۔ لیکن شرافت، انسانیت اور ادب و تہذیب کے قواعد کے اندر اندر۔ مگر اُسے ان تمام مساعی کے باوجود سوائے مایوسی کے اور کچھ حاصل نہ تھا۔ اور نہ حاصل ہوتا ہی نظر آتا تھا۔ مگر جوں جوں اس کی ناکامی کا زمانہ دراز ہوتا جاتا تھا اس کا شوق بڑھتا جاتا تھا، اور اس کی ان مایوسیوں میں اُس کے حق میں میرے جذبۂ ہمدردی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

یورپ میں مختلف قسم کے ناچ ہوا کرتے ہیں۔ اتفاق سے اسی قسم کے ناچوں میں سے ایک خاص قسم کا ناچ "فینسی ڈریس" میں ہونے والا تھا۔ یہ وہ ناچ تھا کہ جس میں مشرق و مغرب کی قید اُٹھ جاتی ہے۔ لوگ مختلف اقسام و ممالک و اقوام کا لباس پہن کر اس میں شریک ہوتے ہیں۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ آج ضرور جاؤنگا اور رقص میں حصّہ لوں گا۔ چنانچہ قدیم اندلسی عرب امیرزادہ کا لباس میں نے اپنے لئے منتخب کیا اور اسی لباس میں اس بزم رقص میں شریک ہوا۔

اِس رقص کی مجلس میں بہت سی پابندیاں اُٹھ جاتی ہیں۔ جس قدر مرد و عورت اِس میں شریک ہوتے ہیں وہ اُن تمام قیود کو دور کردیتے ہیں جن کی پابندی اور رعایت عام طور پر کی جاتی ہے۔ مثلاً وہ بغیر تعارف کے آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ وہ سابقہ شناسائی کے بغیر بے تکلف ہوتے ہیں۔ وہ بغیر پہلے وعدہ کئے ملتے ہیں۔ ان میں سے جو جس سے چاہے رقص کرسکتا ہے اور کرتا ہے۔ غرض ان آپس کی ملاقاتوں میں بوڑھے اور جوان، مرد و عورت اور نشست و برخاست میں قاعدے قانون کی قید باقی نہیں رہتی۔

میں نے دیکھا کہ اس مجلس رقص میں غزال بھی موجود تھی۔ اُس سے مجھ سے پہلے کوئی رسم و راہ نہ تھی۔ لیکن مجھے یہ موقع غنیمت معلوم ہوا کہ اس سے ملوں اور آج اس سے اپنے رفیق عرب کے حال پر التفات کی سفارش کروں اس غریب کا حال بتا کر اس سے التجا کروں کہ اگر اور نہیں تو کم از کم اس سے اتنی بے التفاتی تو نہ کیا کرے کہ وہ بات سے بھی محروم رہے۔ جب وہ چاہتا ہے کہ اس سے راہ و رسم بڑھے تو کیا وجہ ہے کہ وہ اس کی معصوم خواہش کو ٹھکرا رہی ہے۔ میں نے ارادہ کیا کہ رقص میں اس کا شریک بنوں گا اور اپنے

دوست کی وکالت کروں گا۔ آپ باور کیجئے کہ اب تک میرے دل کو اس سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا میرا سچا ارادہ اور مخلصانہ خیال یہی تھا کہ "غزال" کو اپنے دوست سے ملا دوں، کیونکہ اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کی یہ پائمالی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔

بہرحال میں نے غزال کو رقص کرنے کی دعوت دی، میری یہ حرکت آپ کی نگاہ میں غیر معمولی ہو، مگر وہاں کے آداب کے لحاظ سے غیر معمولی نہ تھی۔ اِس لئے کسی نے کچھ بھی خیال نہ کیا اور ہم دونوں ناچنے لگے۔ ہم ناچ رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے میرے لئے غزال سے باتیں کرنے کا اِس وقت اور کیا موضوع ہو سکتا تھا اس لئے میں نے پوری آزادی اور صفائی سے اپنے عرب دوست کا قصۂ شوق سُنانا شروع کر دیا اور کہا کہ "غزال تم ہر روز میوزیم میں آتی ہو، میں بھی وہاں آتا ہوں میں نے تم کو وہیں ایک بار نہیں بارہا بارہا کیا روز دیکھا ہے لیکن میرے ساتھ وہاں میرا ایک دوست بھی ہوتا ہے۔ میرا وہ دوست تم سے ملاقات چاہتا ہے۔ اور تم اُس کی طرف دیکھتی بھی نہیں ہو۔" اُس نے پوچھا "وہ کون شخص ہے"؟ میں نے کہا "وہی جو تمہارے سامنے بیٹھا کرتا ہے۔ اُس کی خواہش ہے کہ تم سے ملاقات کرے تم سے راہ و رسم بڑھائے۔ وہ تم سے ملنے اور بات کرنے کے لئے بے تاب ہے۔ مگر خدا جانے تم نے بے زبانی کا سبق کہاں سے پڑھ لیا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ کم سخنی اچھی چیز ہے لیکن اس حد تک اسے کیسے روا رکھا جا سکتا ہے۔"

میری یہ وکیلانہ تقریر سوسائٹی کے عام قواعد اور پہلی ملاقات کے لحاظ سے کتنی ہی ناموزوں ہو۔ مگر آج کی بے تکلفیوں میں بالکل معمولی بات تھی۔ اُس نے میرا بیان سُنا ہنسی اور مجھ سے وعدہ کیا کہ "اچھا ضرور میں تمہارے دوست سے ملوں گی"۔

میں نے اپنے عرب دوست کی بہت تعریف کی۔ اس کے حُسن کی، اُس کے اخلاق کی، اُس کی شرافت کی، اس کے علم و دانائی کی۔ باور کیجئے کہ میرے بیانِ تعریف میں ایک لفظ بھی خلافِ واقعہ نہ تھا۔ میں نے جو کچھ کہا صحیح کہا اور دل سے کہا۔ وہ میری باتیں سنتی جا رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ رقص کے بعد اُس نے کوئی ٹھنڈی چیز پینا چاہی، میں نے پیش کی اور کل کی ملاقات کے وعدہ پر ہم دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔

میں مکان پر پہنچا۔ اپنے دل میں خوش تھا کہ اپنے دوست کی کوئی خدمت کر سکا۔ جاتے ہی میں نے اُسے سارا ماجرا سُنایا اور آخر میں کل کی ملاقات کا مژدہ دیا۔ پہلے تو اُسے اس مجلسِ رقص میں شامل نہ ہو سکنے کا رنج محسوس ہوا۔ مگر جب کل کی ملاقات کا مژدہ سُنا تو خوشی سے اُچھل پڑا۔ غرض اسی کی باتیں کرتے ہوئے، کل کی ملاقات پر خوشی مناتے ہوئے وہ سو گیا۔ اب اُس کی وہی حالت تھی جس کا نقشہ نظیری نے یوں کھینچا ہے ؎

شبِ امید بہ از روزِ عید می گذرد　　　　کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفت است

دوسری صبح آئی۔ میرا دوست بیدار ہوا تو وہی غزال کی باتیں تھیں اور اُس کا عربی زورِ بیان اور ملاقات کی تیاریاں

آج اُسے علم تھا کہ ملاقات ہونے والی ہے اِس لئے اُس نے اپنے لباس میں اور زیادہ اہتمام سے کام لیا۔ وقتِ موعودہ سے پہلے اُس کی بے تابی قابلِ دید تھی۔ آخر وقت آیا اور ہم میوزیم میں اس طرح کہ ہم پہلے عمارت میں داخل ہوئے اور وہ ذرا بعد۔ اب اُس کی بیگانہ وشی کا وہ پہلے کا سا عالم نہ رہا تھا۔ میں نے اُس کے آتے ہی بڑھکر دونوں کا تعارف کرادیا۔ وہ اس سے خوشی سے ملی اب کیا تھا میرے دوست کا دماغ عرشِ معلّٰی پر پہنچ گیا۔

جب اِن دونوں میں ملاقات ہوگئی۔ گویا میرا کام ختم ہوچکا تھا۔ گو میں بالکل غیر متعلق حیثیت اختیار نہ کرسکتا تھا۔ مگر میں چاہتا تھا کہ وہ دونوں زیادہ سے زیادہ ملیں اور میں غزال سے کم سے کم ملوں۔ البتہ یہ ضرور دیکھتا رہوں کہ اس ابتدا کی انتہا کیا ہوتی ہے۔ وہ لوگ ملتے رہے۔ یوں میں بھی ملاقات کیا کرتا تھا۔ غزال اچھے گھرانے کی، تربیت یافتہ اور علم و ہنر سے پیراستہ اور روشن دماغ لڑکی تھی۔ قدرت نے اُسے جیسا بے پناہ حُسن دیا تھا ویسا ہی عالی دماغ اور منور دل اور معصوم ضمیر بھی عطا کیا تھا۔ یہ باتیں کم نفس واحد میں کم جمع ہوا کرتی ہیں۔ مگر جب ہوجاتی ہیں تو اور تو اور خود قدرت اپنے اِس شاہکار پر فخر کیا کرتی ہے کائنات کا ذرہ ذرہ اس پر نازکرتا ہے۔ غرض غزال میں تمام وہ باتیں بدرجۂ تکمیل موجود تھیں جن کے وجود اور ترکیب کا نام انسان یا اِس سے لطیف تر نام "عورت" یا قدرت کی کاریگری وصنّاعی کا معراجِ کمال کہلایا کرتا ہے۔ آپ الفاظ میں اس کی تصویر نہ کھچوا یئے کہ میری زبان اُس کے حُسن کے بیان میں "الکن" اور "عجمی" ہوکر رہ جاتی ہے۔

ہاں تو ہم ملا کرتے تھے۔ یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ دونوں ملا کرتے تھے۔ میں بھی ان سے ملا کرتا تھا۔ مگر تیسرے شخص کی حیثیت سے یعنی دو دوستوں کا تیسرا ملنے والا کیونکہ معاملہ اُن دو میں تھا۔ ان کی ملاقاتیں روزانہ ہوتی تھیں جو میوزیم تک ہی محدود نہیں رہتی تھیں۔ بلکہ ہم ریستاراں میں ملتے، سنما میں ملتے، میدانوں میں جاتے، گلزاروں کی سیر کرتے۔ کبھی میرا دوست اُس کی دعوت کرتا بلکہ اکثر کرتا۔ کبھی وہ اُس کی دعوت کرتی۔ یہ کہنا لاحاصل ہوگا کہ کبھی کبھی میں بھی ان دونوں کی دعوت کیا کرتا۔

لیکن تعجب ہے کہ جس قدر میرے عرب دوست کی نیازمندی بڑھتی گئی شیفتگی میں اضافہ ہوتا گیا، شوق میں ترقی ہوتی گئی ان سب جذباتِ لطیف و پُرجوش کا جواب غزال کی طرف سے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اس سے بیگانہ وار تو نہیں شناساؤں اور اچھے ملنے والوں کی طرح ملتی تھی۔ مگر وہ چیز جس کی خواہش میرے عرب دوست کو تھی۔ اور ان دونوں کے میل ملاپ کے جس نتیجہ کا میں منتظر تھا اس کے امکان کا غزال کی طرف سے پتہ بھی نہیں تھا۔ ان کی ملاقات کوئی پابندِ رسوم ملاقات نہ تھی، مگر پھر بھی رسمی حدود سے آگے اُسے نہ بڑھنا تھا نہ بڑھی۔

آپ حیران نہ ہوں کہ غزال کی ملاقات کا اسلوب و طریق میرے عرب دوست کے لئے ایسا کیوں رہا جیسے میں اوپر بیان کرآیا ہوں۔ اُس کی توجہ اِسی آپ کے نیازمند سہیل کی طرف زیادہ سے زیادہ ہوتی جارہی تھی۔ آپ باور کیجئے کہ میں نے ان دونوں

کو اُنہی کے لئے ملانا چاہا۔ اِس لئے کہ مجھے اپنے عرب دوست پر رحم آتا تھا۔ ان کی ملاقات کرانے یا ان کے تعلقات بڑھانے میں میری طرف سے جو کوشش ہوئی اُس میں کوئی ذاتی غرض یا کسی قسم کی ذاتی خواہش نہ تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ابتدا ہی میں عرب دوست کا نام کیوں لیتا، خود ہی ملنے کی راہیں کیوں نہ نکالتا۔ رقص کے بعد اپنے اس دوست کو غزال کی ملاقات کا مژدہ کیوں سُناتا، ان کو باہم کیوں ملنے دیتا اور ان کے لئے یہ مواقع مہیا کر کے خود کیوں غیر بنا رہتا۔ اور غیر ہی کی طرح انکے معاملۂ شوق کو میں دیکھتا کا واقعہ یہی ہے کہ میری تمام کوششیں اپنے بھائی کے لئے تھیں اور یہ ایسی بات تھی جس کا کوئی منکر نہ تھا۔ اور نہ کوئی منکر ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرا عرب دوست جو بلا کا ذہین اور طباع تھا اور خود محبت نے بھی جس کے حواس کو اور تیز کر دیا تھا کم از کم اس بارے میں اِس معاملہ کی حقیقت کو پا گیا۔ اُس نے جان لیا کہ غزال کو گو اس سے التفات تو ہے مگر ایک اور قسم کا۔ اور اس کے مقابلہ میں مجھ سے جو لگاؤ ہے وہ اور قسم کا ہے اور بڑھتا جا رہا ہے۔ اور وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ ظاہرًا و باطنًا اِس معاملہ میں میرا کوئی دخل نہ تھا۔ اب جو کچھ ہو رہا تھا غزال کی طرف سے تھا۔ آپ کا سہیل یا اُس کا ہم قوم سہیل کسی غداری، کسی بے وفائی، یا کسی خیانت اور کسی قسم کی دوست کُشی کا گناہ گار نہ تھا۔

اگر معاملہ دگرگوں ہوتا تو جانے کیا ہوتا یا ہو جاتا، مگر میرے عرب دوست نے قدرت کے، یا زیادہ صحیح یہ ہو گا کہ غزال کے فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ اور بجائے میرا دشمن ہونے یا مجھے اپنا دشمن سمجھنے یا غزال سے نفرت کرنے کے اُس نے وہ روش اختیار کر لینا چاہی جو اب تک ان دونوں کے بارے میں میری رہی تھی۔ یہ سب مراحل خاموشی میں بغیر کسی اظہارِ خیال کے طے ہو رہے تھے کہ اتنے میں میرے عرب دوست کو پیرس سے ایک تار آیا۔ جہاں کسی خاص معاملہ میں اس کی ضرورت تھی اور یہ ایسا معاملہ تھا کہ وہ اسے ٹلا نہ سکتا تھا۔ وہ جانے پر مجبور تھا۔ اُس نے شاید رات کی تنہائیوں اور دل و دماغ کی پہنائیوں اور گہرائیوں میں اپنی محبت کی پامالی کا ماتم کیا۔ مگر پیرس کو جانے سے پہلے یہ کہہ کر مجھے غزال کے سپرد کر دیا کہ "غزال! میں سہیل سے جدا ہوتا ہوں تم اس کا خیال رکھنا اس کو آرام پہنچانا۔"

امید تھی کہ عرب دوست کا کام جلد ختم ہو جائے گا اور وہ کچھ دن کے بعد پیرس سے واپس آ جائے گا مگر خلافِ توقع اس کا قیام طول کھینچ گیا۔ اُس کے خطوط غزال کے نام متواتر آتے رہتے تھے ان میں اُسے یہی تاکید ہوتی تھی کہ دیکھنا سہیل کو کھو نہ دینا۔ میں واپس آ کر تم سے سہیل کو لونگا اور خوش لونگا۔ اس کے دل کو رنجیدہ نہ کرنا کہ اس کا رنجیدہ ہونا دنیا کو میری نگاہ میں تاریک بنا دے گا۔

غزال اور فرید کے تعلقات مجھ سے پوشیدہ نہ تھے۔ غزال کا مجھ سے التفات میرے لئے معمہ تھا۔ پہلے اگر ہم کم ملتے تھے تو اب زیادہ ملنے لگے۔ پہلے اگر صرف میوزیم میں ملا کرتے تھے تو اب برلن کے تمام جمیل اور مشہور مقامات میں ہماری ملاقات ہوتی تھی

فراغت کے تمام لمحے، فرصت کے تمام مواقع، تعطیلات کے تمام اوقات میرے اور غزال کے باہم مل کر صرف ہوا کرتے تھے۔ اُس نے اپنے گھر والوں سے میرا تعارف کرا دیا تھا۔ اُس کے والد جو خود بھی عالم تھے، علم کے قدر دان تھے۔ وہ بوڑھے تھے مگر ہمارے ملک کے جوانوں کا کیا منہ ہے کہ ان کے سامنے بات کر سکیں اور جوانی کا دم بھر سکیں۔ وہ صحت و توانائی، وہ ہاتھ پاؤں کی تازگی، وہ کام کرنے کی استعداد و اہلیت، وہ نہ تھکنے والا عزم کہ رشک آتا تھا۔ انہیں دیکھ کر ہندوستانیوں کی حالتِ زار پر رونا آتا تھا کہ جہاں بڑھاپا آیا تو ہندوستانی مردہ سے بدتر ہو جاتا ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کی جوانی بھی موت کے قریب قریب ہی ہوا کرتی ہے۔ ساٹھ برس کی عمر میں ورزش، کام دھندے کی مشغولیت، دوڑ دھوپ، گھوڑے کی سواری وغیرہ غزال کے والد کا معمول تھا۔ غزال کی ماں بھی زندہ تھی۔ عجیب فرشتہ خصلت عورت تھی۔ اس کا بڑھاپا بھی ہماری ہندوستانی عورتوں کی طرح قابلِ رحم بڑھاپا نہ تھا کہ جس سے غیر تو غیر اپنے بھی پناہ مانگنے لگتے ہیں۔

میں اُن کے گھر میں اکثر بلایا جاتا تھا۔ خود بھی اکثر جاتا تھا۔ ہمیشہ خندہ پیشانی اور مسرور دل اور پھیلے ہوئے ہاتھوں سے میرا استقبال ہوتا تھا۔ غزال کے والدین نے پہلے پہل تو شاید ہماری بڑھتی ہوئی ملاقاتوں کو کسی قدر اجنبیت کی نظر سے دیکھا تھا، مگر وہ اپنے جگر پارے کی طبیعت اس کی دماغی اور قلبی حالت سے خوب واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی غزال کا ضمیر جذبات سے نہیں بلکہ فہم و فراست، پاکیزگی و لطافت اور علم و ہنر سے اُٹھایا گیا ہے اس لئے اگر انہوں نے پہلے پہل مجھ اجنبی کو نقادانہ نظر سے دیکھا تھا تو اب اپنے اندازے میں پورا یقین کر کے پدرانہ اور مادرانہ شفقت سے میرا استقبال کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ہم دونوں کو جب بھی تنہا دیکھا ہمیں اسی حال میں پایا کہ ہم دو طالب علم ہیں اور فقط علم کی حور امداد کی پری پر فدا ہیں۔ ہمارا موضوع کلام لٹریچر تھا، خواہ وہ کسی قسم کا ہو، فلسفہ تھا خواہ قدیم ہو یا جدید۔ غزال کی وسعتِ نظر ادب و فلسفہ میں میرے لئے حیرت افزا تھی۔ ہماری گفتگو جرمن زبان میں ہوا کرتی تھی۔ اور روز کی ملاقات اور ان ہر روز کے علمی بحث مباحثوں نے میری زبان کی روانی اور میری زبان دانی میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ جو چیز لوگوں کو کہیں برسوں میں جا کر حاصل ہوا کرتی ہے وہ مجھے غزال کی ہم نشینی کی بدولت مہینوں نہیں دنوں میں حاصل ہو گئی تھی۔

آپ جانتے ہیں کہ گوئٹے جرمنی ہی کا نہیں یورپ کا بلکہ صرف یورپ کا نہیں دنیا بھر کا شاعر مانا جاتا ہے۔ جرمنی والے تو اُس کو اپنا قومی اور وطنی شاعر سمجھ کر اس کی تعریف ہی نہیں اس کی پرستش کرتے ہیں۔ جرمنی کے نوجوانوں کے خیالات، اعتقادات، احساسات پر گوئٹے کا فاؤسٹ چھایا ہوا ہے۔ اِس لئے مجھے کچھ بھی حیرت نہ ہوئی جب میں نے دیکھا کہ غزال کو فاؤسٹ کے صفحات از بر تھے۔ اور وہ اس کے نکات بڑی ہی شیریں زبانی سے ادا کیا کرتی تھی۔ جب وہ فاؤسٹ کی اتنی شیدا تھی تو اس کے خیالات کیسے حکیم فاؤسٹ سے مختلف ہو سکتے تھے۔ وہ کبھی چرچ میں نہ جاتی تھی۔ وہ تو وہ اُس کے گھر کے اور لوگ بھی نہیں

بھی کوئی چرچ نہ جاتا تھا نہ جانے کی وجہ یہی تھی کہ چرچ والے جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں۔ دُوسرے لوگوں میں جو کچھ دیکھنا چاہتے ہیں خود ان میں ان باتوں کا نام نشان نہیں۔ ان کی رسوم و قیود کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان کی عبادات دکھاوا ہیں ان کی رسوم محض قیود ہیں معنویت سے خالی۔ زندگی کی کوئی منزل ان سے آباد نہیں۔ قلب کا کوئی گوشہ ان سے روشن نہیں۔ سینہ کا کوئی حصّہ ان سے شاداب نہیں۔ ان کی تصویریں جعلی ہیں۔ ان کے انعامات فرضی ہیں۔ ان کے مظنونات اوہام ہیں۔ ان کے یہ خود ساختہ تمام جال انسانوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرنے کے لئے ہیں۔ انسان کو انسان سے ملانے اور بحیثیت انسان کے اس کی محبت، اس کی خدمت، اس کی قدر، کہنے دیجئے کہ اس کی پرستاری و پرستش کرنے کے لئے نہیں اس لئے وہ انسان جو ان رموز کو سمجھتا ہے، کیوں فریب نفس میں مبتلا ہو۔ کیوں اپنے یقین و بصیرت کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرے اور ان وسیسہ کاروں کی مخترعہ بدرنگی سے اپنے قلب کے آئینہ کو داغ دار کرے۔ وہ گذشتہ کی الجھن میں پڑتی نہ تھی۔ وہ آئندہ کے لئے فکرمند نہ تھی۔ وہ "حال" کی قائل تھی۔ وہ "روح" کی مذہبی اصطلاح کی منکر تھی۔ وہ "روحانیت" کی "پادریانہ گپ" کی کافر تھی۔ مگر دل کی صفائی، دماغ کی عقلیت اور ضمیر کی روشنی پر جان فدا کرتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ تمام مذہبی عمارات کو مفید اداروں میں منتقل کر دینا چاہیئے وہ کہا کرتی تھی کہ انسان کو انسان سے نفرت سکھانے والی اور انسان کو انسان کے خون کا پیاسا بنانے والی تمام کتابوں کو دریا بُرد کر دینا چاہیئے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ وہ لٹریچر کی شیدائی تھی اسی لئے اُسے انگریزی زبان سے بھی اُنس تھا۔ اور وہ انگریزی زبان کے ادبِ عالیہ پر نثار تھی۔ اُس نے ملٹن اور شیکسپیر کو غور سے مطالعہ کیا تھا۔ انگریزی میں کبھی کبھی کچھ نہ کچھ لکھا بھی کرتی تھی۔ میں اپنی معلومات کے مطابق اُس کے اِس انگریزی ادب سے شغف میں اور ترقی دے رہا تھا۔ انہی مضامین پر ہمارا اکثر تبادلۂ خیالات رہا کرتا تھا۔ اس نے بہت سے مقالات لکھے تھے، جن میں میرا مشورہ شامل ہوتا تھا۔ ملٹن پر اس نے ایک خاص مقالہ لکھا تھا۔ اس کی تکمیل میں میرا بھی خاصہ حصّہ تھا۔

ہم دونوں دوست تھے، دو طالب علم دوست۔ جو علم کی فضا میں سانس لیتے اور علم ہی کی فضا میں پرواز کیا کرتے۔ اور علم ہی کے بسیرے میں ایامِ زندگی بسر کر رہے تھے۔ دنیا میں اور کون کون سے مسائل ہیں جو توجہ طلب ہیں ان سے ہمیں واسطہ نہ تھا۔ مرد و عورت یہ دو اصنافِ مختلف آپس میں کیوں ایک دوسرے سے ملتفت ہوتے ہیں؟ اس سے ہم بہت بلند اور بہت ہی مقدس تھے۔ ہمارا مطمحِ نظر گوشت پوست سے بہت پرے، قلب و دماغ کی گہرائیوں اور عالمِ معنویات سے متعلق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہماری باتوں میں ان جذبات کا عنصر اب تک کبھی نہ آیا تھا۔ ہماری نگاہیں، ہماری حرکات و سکنات، ہماری نشست و برخاست، ہماری باتیں، ہمیں علم کا پروانہ تو ظاہر کر سکتی تھیں مگر دنیا کے رواج کے مطابق ایک دوسرے کا دیوانہ نہ کہہ سکتی تھیں۔

میں جب تک برلن میں رہا ہمیں اکثر و بیشتر تنہا ملنے کا اتفاق ہوا۔ بعض ایسی تقریبات بھی پیش آئیں کہ جن میں جرمنی کا
بچہ بچہ جنگلوں، بیابانوں، مرغزاروں، لالہ زاروں میں پہنچ جاتا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے مذاق کی داد دیتا اور اپنے دل کی ارمان نکالتا
ہے۔ یہ وہ ایام اور ایسے موسم ہوتے ہیں کہ جن میں جذبات کا وفور انسان کو سرور کی وجہ سے مجنون بنا ڈالتا ہے۔ ایسے مواقع پر بھی جب
بہتر سے بہتر منظر ہمارے سامنے اور محفوظ سے محفوظ قابلِ رشک کنجِ تنہائی میں ہم دونوں بیٹھے ہوا کرتے تھے ہماری گفتگو کبھی ان
حدود سے آگے نہیں بڑھی جو دماغوں کو ایک کر دیا کرتے ہیں۔ ہمارے لئے ہماری تنہائیاں تماشا گاہ ہوتی تھیں اور تماشا گاہ
کنجِ خلوت کا سکون و سکوت۔ اسی عالم میں ہماری زندگی بسر ہو رہی تھی کہ میرے قیامِ برلن کی مدت تمام ہو گئی۔ جس مقصد سے میں
اس مدینۃ العلم میں مقیم تھا وہ حاصل ہو چکا تھا۔ اس لئے اب وہ گھڑی آ گئی کہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہوں۔ . . . . . .
. . . . . . غزال کے گھر والوں کے لئے بھی میرا ان سے جدا ہونا شاق تھا۔ غزال کے والد
کو افسوس تھا کہ میں ان سے جدا ہو رہا ہوں۔ غزال کی والدہ کو افسوس تھا کہ میں ان کے وطن سے جا رہا تھا۔ اس کے بھائی جو وطن میں تھے
ان کو بھی صدمہ ضرور تھا۔ کہ ان کے گھر میں اس بے تکلفی سے اپنوں کی طرح آنے اور رہنے والا پردیسی ان سے جدا ہو رہا تھا۔ لیکن غزال کی
اور میری جدائی کا اور ہی عالم تھا۔ وہاں جسم و روح کی جدائی نہ تھی۔ بلکہ روح کی روح سے جدائی کا مسئلہ درپیش تھا۔ آخر ہم دونوں میں طے
یہ ہوا کہ اگر ہو سکے تو میں وطن کو واپس ہونے سے پہلے پھر جرمنی آؤں گا۔ ورنہ غزال تو ضرور انگلستان آئے گی۔ خواہ آنے میں اس کا
کوئی اور کام ہو یا نہ ہو۔ لیکن مجھے ملنا اہم فرض اور مقدس فرض ہوگا۔

میں انگلستان گیا۔ تعلیم کا بقیہ کام پورا کیا۔ ڈاکٹری کی ڈگری لی، اور یورپ کے تمام مستشرق علما کے مجمع میں مشرق کی نمائندگی
میں جو مقالات میں نے پیش کئے وہ توجہ سے سنے گئے۔ اور آپ کے ناچیز دوست کی تحقیق اور آزادی و اصابتِ رائے کی داد ملی
اخبارات نے ان واقعات کی دھوم مچا دی جس سے دوست خوش اور حاسد شاید ناخوش ہوئے ہوں گے۔ یوں تو میری کامیابیوں کی خبریں
برلن میں بھی پہنچی ہوں گی۔ مگر میں نے ان مجالس کی روداد کے مطبوعہ تراشے غزال کو بھی بھیج دیئے۔ وہ ان کو دیکھ کر خوش ہوئی کیونکہ
جن الفاظ میں اس نے میرے کارناموں کو سراہا اب تو نہیں کسی اور وقت آپ کو ضرور دکھاؤں گا۔ لیکن سلسلۂ کلام کے لئے اتنا یاد رکھیے
کہ جب انگلستان میں بھی میرا کام تمام ہو چکا۔ تو میرا ارادہ مصر و شام اور اپنے وطن میں ہوتے ہوئے ہندوستان واپس آنے
کا تھا۔ لیکن میں وہاں سے قدم باہر نکال سکتا تھا جب تک میں غزال سے یا غزال مجھ سے کم از کم ایک بار نہ مل لیتی۔ انہی دنوں
میں مجھے پہلے ایک خط ملا کہ وہ عنقریب برلن سے روانہ ہو کر لندن آنے والی ہے، اور پھر اس کے بعد تار آیا کہ وہ وہاں سے روانہ ہو چکی
ہے۔ اب کیا تھا، دل کا کنول کھل گیا اور برلن سے مجھے وہی خوشبو آنے لگی جو رودکی کو رودِ مولیاں سے کبھی خاص وقت آئی تھی۔
غزال لندن میں آن پہنچی اور میں اس کے استقبال میں تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس کا قیام ایک ہوٹل میں تھا۔ لیکن وہ دن کا بیشتر

حصّہ میرے ساتھ ہی رہا کرتی تھی۔ میں نے اُسے لندن میوزیم دکھایا۔ لندن یونیورسٹی دکھائی۔ وہاں کے تمام قابلِ دید مقامات دکھائے اور قابلِ ملاقات اربابِ علم و ہنر سے اُس کی ملاقات کرائی میرا مطلب اُن اصحاب سے ہے۔ جن تک میری رسائی تھی۔ غرض میری وجہ سے وہ لندن میں اجنبی نہ تھی۔ اگر میں نہ ہوتا تو میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ لندن میں پریشان ہوتی، مگر یہ ضرور ہے کہ میری وجہ سے اُس کے لئے لندن اور برلن میں کوئی اجنبیت محسوس نہ ہوتی تھی۔

یہ کہنا تطویلِ کلام ہے کہ ہماری ملاقاتوں اور گفتگو میں علمی مسائل زیر بحث زیادہ رہا کرتے تھے۔ ہاں اب میرے خیالات میں ایک رجعت پیدا ہو رہی تھی یعنی میں اسپر قانع رہتا نظر نہ آتا تھا کہ ہماری گفتگو علمی اور ذہنی مسائل تک ہی محدود رہا کرے۔ بلکہ میں چاہتا تھا کہ اس میں کسی اور بات کا بھی کسی قدر اضافہ ہو۔ پھر میں اس پر بھی مطمئن نہ تھا کہ ہم دونوں جو ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور جن کے مذاقوں میں اس حد تک یکسانیت و وحدت موجود ہے مشرق و مغرب میں الگ الگ رہیں۔ کیوں ایسا نہ ہو کہ مغرب مشرق کو اپنا وطن بنالے اور غزال مغربی ہو کر مشرق کے مطلع سے صورتِ آفتاب برآمد ہو۔ کیا اس سے میری زندگی پر مستقل نہ ہو جائے گا۔ اگر یوں ہو تو میرے دماغ کی پرواز ہفت افلاک سے پرے تک کی رہا کرے گی۔ کیا اس سے میرے علمی کارناموں میں چار چاند نہیں لگ جائیں گے۔ کیا اگر غزال میرا دایاں بازو بن جائے تو میں علمی اور تحقیقی دنیا میں ایک انقلابِ عظیم برپا نہیں کردوں گا۔ اب تو میں کھلے کھلے لفظوں میں آپ سے یہ باتیں اور یہ مراتب کہہ رہا ہوں مگر میرے دل نے یہ مدارج آہستہ آہستہ طے کئے تھے۔

لندن سے میری جدائی کا خیال غزال کے لئے بھی گراں تھا۔ اس نے برلن سے میرے چلے آنے کو اتنا مشکل ایسا کٹھن قرار نہیں دیا تھا جس قدر وہ میرے یورپ سے چلے آنے کو محسوس کرنے لگی تھی۔ اور جس قدر ہماری جُدائی کے ایام قریب ہوتے جا رہے تھے اس کے میرے ساتھ رہنے کے اوقات میں زیادتی ہوتی جاتی تھی۔ جس طرح میرا دل اس پر راضی نہ ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے الگ ہو اسی طرح کی کیفیت کچھ اس کی بھی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لندن میں اس کے قیام کا کوئی ممکن لمحہ بھی سوائے میری صحبت کے کسی اور جگہ یا کسی اور کام میں صرف ہو۔ الّا یہ کہ وہ رات کو جائے اور اپنی قیام گاہ پر سو جائے۔ ابھی لندن سے میری واپسی میں تو کچھ دن باقی تھے مگر خود اس کے لندن سے برلن واپس چلے جانے کا وقت قریب سے قریب تر آگیا۔ اِس سے ہمارے دلوں کی سکون میں طوفان کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ گویا مسائل فلسفہ ہمیں فراموش ہونے لگے۔ گویا ہم ایک دوسرے سے قریب تر ہو کر اپنے آپ کو ایک دوسرے سے بعید تر محسوس کر رہے تھے۔ گویا ہمارا قُرب ہمارے باہمی تباعد کا مصداق تھا۔ گویا ہماری زبانیں سخن دانی اور سخنوری بھول گئیں تھیں۔ گویا دنیا کی تمام علمی کتابیں ہماری نگاہ میں سادہ اوراق کے مجموعے رہ گئے تھے۔ گویا ہم اپنی زندگیوں کی شادمانی کا حصّہ کبھی کے سے چکے تھے اور اب ہمارے حصّہ میں شادمانی زندہ دلی اور بشاشت کے عناصر باقی نہ رہے تھے۔ ہم کس بھنور میں تھے ہمیں کچھ پتہ نہ تھا۔ ہم ان برف کی سلوں کے نیچے سے کیسے سر اُٹھائیں اور ان سے کیسے نکلیں۔ اس

عالم بے کسی و بے زبانی سے کیونکر برآمد ہوں، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ گو کہنے کو ہم دونوں ساتھ پھرتے تھے۔ ساتھ اٹھتے اور بیٹھتے تھے ساتھ کھاتے اور پیتے تھے اور باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہنس بھی لیا کرتے تھے لیکن وہ بات جو پہلے تھی کہ ہم علم کی ہوا میں سانس لیا کرتے تھے، باقی نہ رہی تھی۔ اب ہماری شان ایک تازہ پھول اور ایک شیدا بلبل کی سی نہ رہی تھی۔ ہم میں ایک دوسرے سے جدا ہونے کی تاب نہ تھی۔ ہم ایک دوسرے سے جدا رہنے سے ڈرتے تھے۔ ڈرتے تھے موت سے کے سے خوف سے۔ لیکن ہمارا قرب بھی اس خوف پر غالب نہ آسکتا تھا۔ یہ کیا عالم تھا۔ الفاظ اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہاں اگر کسی پر یہ حالت وارد ہو تو وہ اُسے محسوس کر سکتا ہے۔ ایسے ہی جیسے ہم نے محسوس کیا تھا۔ شاید حزیں کے یہ الفاظ بھی کسی حد تک ہماری اُس وقت کی حالت کی عکاسی کر سکتے ہوں۔ ؎

من از حیرت نوازشگیں نہ ایمائے نہ تقریرے بداں مانند کہ ہم بزم ست تصویرے بہ تصویرے

آخر وہ وقت آگیا کہ یہ گتھی سلجھ جائے اور عقدۂ لاینحل حل ہو جائے اور دل کا راز زبان پر آجائے اور یہ گو مگو کا عالم باقی نہ رہے۔ ایک دن ہم دونوں دریائے ٹیمز کے کنارے ایک خاص قطعۂ زمین پر بیٹھے تھے۔ ہم جہاں بیٹھے تھے تنہا تھے۔ ہم دو تھے تیسرا کوئی نہ تھا۔ ہمارے قریب قریب کسی آدم زاد کا پتہ نہ تھا۔ اس وقت دفعۃً میں نے محسوس کیا کہ میری حالت وہی جو عشق سے تعبیر کی جاتی ہے اگر یہی ہے تو کیوں نہ اپنا عشق اس پر ظاہر کردوں۔ دیکھوں تو کیا ہوتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ غزال کی طرف سے انکار نہ ہوگا۔ میں جانتا تھا کہ غزال مجھے اس سے زیادہ چاہتی ہے جتنا میں اُسے چاہتا ہوں۔ اس لئے مجھے اعتماد تھا کہ اس مرض عشق کا نتیجہ وہی ہوگا جو میرا دل چاہتا ہے۔ ہماری زندگی کے صفحات ہم دونوں کے سامنے کس شان سے کھلے تھے؟ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی نہ پوچھئے۔ وہ ایک عورت تھی جو شاید آسمان سے انسانوں کی آزمائش کے لئے بھیجدی گئی تھی۔ اُسے دیکھ مذہبی کتابوں کے کم از کم ان حصوں پر میرا ایمان و اعتماد نہ رہا تھا جن میں عورت کو شیطان کی چیلی، گوشت کا بے جان لوتھڑا، یا ٹیڑھی پسلی کی پیداوار، یا ناقصات العقل یا جہنمی، یا جہنم میں زیادہ تعداد میں جانے والی مخلوق، یا مرد کے لئے فتنہ، مرد کے لئے ٹھوکر اور شیطان کا آلۂ کار وغیرہ بتایا گیا ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ پاکیزگی حسن اور علم کے اگر کچھ معنے اور مفہوم ہو سکتا ہے تو اس مفہوم ہی کو غزال کہنا چاہیئے۔ رہا میں، تو میری زندگی کا کوئی راز اس سے پوشیدہ نہ تھا۔ میرے متعلق تمام خفی و جلی باتیں اس کو معلوم تھیں۔ کیونکہ میں اس کو گناہ سمجھتا ہوں، کتمان کو خصوصاً ایسے شخص سے کہ اس میں اور ہم میں محبت ہو، اور ہماری زندگیوں پر ایک دوسرے کا اثر پڑ سکتا ہو یا پڑ رہا ہو۔ یا اثر پڑنے کی اُمید ہو۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے انداز کے مطابق اگر میں علم کی دولت سے مالا مال نہیں تو مفلس اور تہیدست بھی نہیں۔ مگر دولتِ ظاہر کی میرے ہاں وہ فراوانی نہیں۔ اس کو یہ بھی علم تھا کہ میری پہلے کی بیوی موجود ہے، اور وہ بیوی مجھ سے محبت کرتی ہے، اور مجھے بھی اُس سے تعلق خاطر ہے۔ پھر نہ صرف میری بیوی ہی موجود ہے

بلکہ دو بچے بھی ہیں۔ اور اسی بات پر تو وہ کہا کرتی تھی کہ کسی مرد کے دو بیویاں ہونا چنداں عقل کے خلاف نہیں۔ ایک عورت سے ایک مرد شادی کرتا ہے۔ اس سے وہ خوش بھی ہوتا ہے۔ مگر وہ عورت اس کی زندگی میں داخل نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی اس ازدواجی زندگی کے دوران ہی میں ایک دوسری عورت آتی ہے اور وہ اس کی زندگی یا اُس کے دل کے نازک ترین گوشوں میں داخل ہو جاتی ہے اور اتفاق سے وہ اس کی زندگی کا آفتاب اور اس کی زندگی کا نصب العین ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے۔

غرض قضا یہی تھی جو میں نے اُوپر دکھائی۔ حالات وہ تھے جو میں نے اُوپر بتائے کہ میرے ارادوں نے الفاظ کی صورت اختیار کی اور وہ زبان پر آ گئے۔ میں نے کہا۔

غزال! مجھے تم سے محبت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم میری "شریک زندگی" ہو جاؤ۔ میرے یہ الفاظ گو اُسکے لئے اجنبی نہ ہوں مگر اس وقت ان کا یہ اثر ضرور ہوا کہ اس کا رنگ جو پہلے ہی سُرخ و سفید تھا اور زیادہ سُرخ ہو گیا۔ اور دیر تک اس کی یہ حالت رہی آخر وہ سنبھلی اور اُس نے کہا " سہیل مجھے تم سے محبت ہے اور تمہارے اِس اظہارِ محبت پر میں تمہاری شکرگذار ہوں کہ تمہاری زبان پر بھی وہ بات آئی جس کا ورد میرا دل رات دن کیا کرتا تھا۔ تمہاری شریکِ زندگی ہونا میری زندگی کا انتہائی مقصد تھا لیکن اس کے باوجود میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ اس لئے کہ مجھے تم سے محبت ہے اور میری یہی تم سے محبت مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں تم سے شادی نہ کروں۔ اس لئے کہ نہیں معلوم اِس تعلق کا اثر تمہارے قبیلہ والوں پر کیا ہوگا۔ نہیں معلوم تمہارے والدین کی کیا کیفیت ہوگی نہیں معلوم تمہاری محبت شعار بیوی کا کیا انجام ہوگا۔ میں اپنی جگہ تمہارے ساتھ مغرب سے مشرق نہیں بلکہ اگر مشرق سے بھی پرے کوئی اور مقام ہو تو جانے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن میری یہ محبت میری نظر میں ملعون ہو جائے گی اگر میری وجہ سے تمہاری زندگی پر تاریکیاں آئیں۔ تمہارے سامنے مصائب آئیں۔ تمہارے متعلقین کو صدمہ ہو۔ میرے انکار کو کہیں اس کا مصداق نہ سمجھ لینا کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی مل نہیں سکتے"۔ کیونکہ عشق و محبت میں مشرق و مغرب کی کوئی قید نہیں مشرق و مغرب کی قید لوگوں نے اپنے اغراض سے بنائی ہے اور عشق و محبت حدود و قیود سے آزاد ہیں"۔

میں نے کہا " تم نے جو کچھ کہا وہ صحیح ہے۔ لیکن جب تم میرے ساتھ ہو تو میں دنیا کی تمام مخالفتوں کو اپنے راستے سے ہٹا سکتا ہوں۔ آخر دنیا کی مخالفتیں کیا ہیں مصیبتیں کیا ہیں؟ کچھ بھی نہیں اگر اُس کیلئے ہوں جو ہمارا دل ہے یا ہمارے دل میں ہے "۔

غزال نے کہا " یہ تو میں جانتی ہوں کہ تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم پر آفات آئیں میں اپنے آپ کو تمہارے لئے قربان کر سکتی ہوں اِس لئے کہ میری قربانی تنہا میری قربانی ہوگی۔ لیکن میں تم کو قربان نہیں کر سکتی کہ تمہاری قربانی تمہاری قربانی ہی نہ ہوگی میری بھی ہوگی۔ اور تمہارے متعلقین کی۔ میں عورت ہوں اور عورت بھی محبت کرنے والی۔ اور کوئی عورت جو محبت کی رموز سے آگاہ ہو۔ خود غرض نہیں ہو سکتی "۔

اُس وقت دونوں طرف سے ایک ہی آواز پیدا ہورہی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے ہیں۔ میرے ہاتھ میں غزال کا ہاتھ تھا۔ وہ مجھ سے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ میں نے چاہا کہ اُس کے ہاتھ کو اٹھاؤں اُس نے مجھے اٹھانے دیا۔ میں نے چاہا کہ اُس کے ہاتھ کو اپنے لبوں سے لگاؤں لیکن اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھوں کے اعصاب میں کچھ کھچاوٹ سی آرہی ہے۔ اِس لئے میں نے سمجھا کہ وہ راضی نہیں کہ میں اس موقع پر اُس کے ہاتھ کو بوسہ دوں۔ اگر میں جسارت کرتا تو کرسکتا تھا مگر یورپ کی عورت کا جو تخیل آپ کی نظر میں ہے میں اُس کی تردید کیلئے نہیں بلکہ اظہارِ واقعہ کے لئے کہتا ہوں کہ اگر میں جسارت کرکے پیار سے لیتا تو اُس کی دنیا بدل جاتی۔ اور اس کے لئے میں راضی نہ تھا۔ بہرحال ہم اس قول و قرار کے ساتھ علیحدہ ہوئے کہ ہم چاہے میاں بیوی ہوکر نہ رہ سکیں مگر مشرق و مغرب میں ہم خیال ہم مذاق دوست ہوکر رہ سکتے ہیں ایسے دوست کہ ہماری دوستی اپنی معنویت کے لحاظ سے دنیا میں خاص چیز ہو۔ اُس نے کہا کہ میں یہ جانتی ہوں کہ میں تمہاری بیوی نہیں ہوسکتی لیکن مجھے ہمیشہ تم سے ایسی ہی محبت رہیگی جو ایک عورت کو ایک مرد سے ہوسکتی ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ اگر برلن میں کوئی ایسا آدمی ہو جو تمہارے دل و دماغ کی خوبیوں کو سمجھ سکے اور قدر کرسکے اور اس کا تمہاری زندگی پر اثر ہو یا ہوسکتا ہو تو اس سے شادی کرلینا کہ شادی کرنا بھی دنیا کا دستور ہے۔ لیکن میں مشرق میں جاکر بھی جہاں میری بیوی موجود ہے عالمِ خیال میں تمہاری ہی پرستش کرتا رہوں گا"

دنیا کو ہمارا فلسفہ اچنبھا معلوم ہوتو ہو مگر ہم اسے حقیقت سمجھتے ہیں ہماری رائے میں شادی دنیا داری ہے اور ایک ایسا معاملہ جو ایک عورت اور ایک مرد میں طے پاتا ہے اور دونوں طرف سے خوش معاملگی کا عہد کیا جاتا ہے جسے جانبین کو پوری شرافت پورے خلوص سے نباہنا چاہئے۔ اور اس کے مقابلہ میں محبت وہ تعلقِ خاطر ہے جو ایک شادی شدہ مرد کو ایک شادی شدہ عورت سے ہوسکتا ہے یا ایک شادی شدہ عورت کو ایک دوسرے مرد سے ہوسکتا ہے۔ بغیر ان تعلقات کے شائبہ کے جو ازدواجی تعلقات کی صورت میں متوقع ہوتے ہیں۔ اِس تعلقِ خاطر کو ان الفاظ میں بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ مروجہ شادی دو جسموں کی شادی ہوتی ہے اور محبت و شوق دو روحوں کی شادی۔ ہوسکتا ہے کہ جن کی جسمانی شادی ہو اُن کی روحانی شادی یا ان کے دلوں کی بھی شادی ہو جائے۔ اسی طرح ضروری نہیں کہ دلوں اور روحوں کی شادی کے لئے جسمانی تعلق کی بھی احتیاج ہو۔ ایسی صورت میں جسمانی تفارق و تہاجر قلبی وصال کے منافی نہیں ہوسکتا۔ اس حقیقت کو کسی اور رنگ اور اور عنوان سے بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔ اِس لئے میں نے اس سے کہا کہ جب یہی فیصلہ ہے کہ ہم قربانی کریں تو ہماری قربانی کی یہی صورت ہوگی کہ ہمارے دل و دماغ کی دنیا ایک دوسرے کے خیالات و تصورات سے آباد رہے، مگر اپنی زندگی کی مادی کیفیات سے ہم غیر متعلق رہیں۔

جب وہ لندن سے واپس برلن کو چلی تو ہم دونوں نے باہم فوٹو نکلوائے اور ہم میں یہ بھی اقرار ہوا کہ خط و کتابت ہماری کبھی منقطع نہ ہوگی۔ میں نے خواہش کی کہ تم جب شادی کرو اور تمہارے بچے تمہارے ایسی ہی غزالی آنکھوں والے پیدا ہوں تو

اپنے فوٹو کے ساتھ ان کے فوٹو بھی مجھے بھیجا۔

غزال کے چلے جانے کے بعد میرا قیام بھی صرف چند روز لندن میں رہا۔ میں وہاں سے مصر آیا اور عمائدِ مصر اور علمائے مصر سے ملا۔ یمن میں پہنچا۔ وطن کی خاک کو آنکھوں سے لگایا۔ یہاں کے امام یحییٰ اور وہاں کے امرا و علما سے ملا۔ آخر خاکِ وطن کو بھی پیچھے چھوڑا۔ اب تمہارے ہندوستان کی سیر کرنے آیا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ یہ ایام غزال کی یاد، فرائض کی بجا آوری اور علم کی خدمت میں بسر کر دوں، مگر میرا افسانہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ بیوی سے ملاقات ہوئی مدت کے بعد۔ بڑا لڑکا جو پانچ برس کا ہے مجھے بھول چکا تھا۔ چھوٹی لڑکی مجھے کیا جان سکتی تھی۔ سب سے ملا۔ والدہ سے ملا۔ والد صاحب قبلہ سے ملا۔ اگر ان کو ایک طرف میری واپسی اور کامیاب واپسی کی خوشی تھی تو اس بات کا رنج بھی تھا کہ میں اُن سے مختلف لباس کیوں پہننے لگا اور ان کی بعض قدیم مسلمہ باتوں میں اپنی مستقل اور اُن سے الگ رائے کیوں پیش کرتا تھا۔ میرے لئے جینا دوبھر ہو جاتا اگر تنہائی میں بیوی اور یوں گھر میں ماں کی محبت مجھے حاصل نہ ہوتی۔ اب اس پر طرفہ یہ ہوا کہ میرے خطوط ولایت جانے اور جرمنی سے برابر خط چلے آنے تھے۔ عورتیں شکی مزاج کی تو ہوتی ہیں۔ سبب پوچھا گیا۔ میں نے بیوی سے نہ وہی جو بات تھی کچھ کچھ حال کہہ دیا۔ کیونکہ اس کے کہہ دینے میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ گھر کے بدلے ہوئے حالات سے زیادہ غزال کی مفارقت کے خیال نے مجھے بے حال بنا رکھا تھا۔ کسی نہ کسی عنوان سے بیوی کے سامنے تقریباً ہر روز اس کا تذکرہ آ ہی جاتا تھا۔ اس کی جدائی کے باعث میری جو حالت تھی وہ اس شمع کی سی ہو رہی تھی جو آہستہ آہستہ جل رہی ہو۔ اُس سے دھواں اُٹھ رہا ہو۔ اور دم بدم اس کی ہستی راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو رہی ہو۔ غزال کے خطوں کی آمد، میرے خطوں کا اُس کے نام جانا، اس کا خط پانا اور اپنا خط بھیجنا، میری حالت میں خاموش تغیرات کا ہونا میری بیوی سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ آخر اُس نے کرید کرید کر پوچھا اور میں نے اس سے سب قصہ کہہ ڈالا۔ اسی طرح جس طرح آپ سے کہا ہے۔ بجائے اس کے کہ میری بیوی حسد کی آگ میں جلنے لگتی اور میری پریشانی کے اور سامان فراہم کرتی اُس نے ایک فداکار اور سچی عورت کی طرح کہا کہ "میں آپ کی مدد کروں گی"۔ اُس کے یہ الفاظ سُن کر میں ہنس پڑا اور بولا "میں بھی تو سنوں کہ اس بارے میں تم میری کیا مدد کرو گی"۔ اُس نے کہا "میں غزال کو خط لکھوں گی اور اُسے مجبور کروں گی کہ چونکہ سہیل کو تم سے محبت ہے، میں عورت ہوں اور اس کی بیوی ہوں مجھے بھی اس سے محبت ہے۔ میری محبت مجھے مجبور کرتی ہے کہ اس کو ہر وقت خوش دیکھوں۔ چاہے منزلِ اول سے ثانی ہی میں منتقل ہونا پڑے۔ اور اگر تم عورت ہو اور سچ مچ تمہیں بھی اس سے محبت ہے تو ہندوستان میں آؤ میں خود اپنے ہاتھ سے سہیل کو تمہارے سپرد کر دوں گی اور پھر تم دونوں کو خوش دیکھ کر آپ خوش ہو لیا کروں گی"۔ چنانچہ اُس نے خط لکھا۔ میں کیا سناؤں آپ خود ہی اُسے پڑھ لیجئے —

پیاری غزال

اِن چند سطور کے لکھنے کی معافی چاہتی ہوں۔ مگر چونکہ اس معاملہ کا تعلق تمہاری مسرت و شادمانی سے ہے اِس لئے میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ تم اِن سطور کو پڑھنے کی عزت عطا کرو۔ میں یہ کہنے کی اجازت چاہتی ہوں کہ میری شادی ڈاکٹر سہیل سے اُس قول و قرار کے مطابق جو اُن کے اور میرے والدین کے درمیان ہوا تھا تقریباً نو سال پہلے ہوئی تھی۔ غالباً یہ جان کر تم حیران ہو جاؤ گی کہ میں نے اپنے خاوند کو پہلی بار اپنی شادی کے بعد دیکھا تھا مگر یہی ہمارے ہاں کا دستور ہے۔ تاہم مجھے یہ کہنے میں مسرت حاصل ہوتی ہے کہ ہماری ازدواجی زندگی بہت خوشگوار تھی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب سہیل کو یورپ جانا پڑا اور ۲½ سال کے قیام یورپ کے بعد وہ وطن واپس آئے مگر کس طرح کہ وہ بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتے ہیں اور اُنھوں نے مجھے بتایا ہے کہ تم بھی اُن سے محبت کرتی ہو۔ جب حالات یہ ہیں تو میں سہیل کو ہمیشہ خوش اور مسرور دیکھنے کے لئے تیار ہوں اور ان تمام حقوق سے دستبردار ہو جانے کیلئے بھی جو مجھے ان پر حاصل ہیں۔ اگر واقعی تمہیں اُن سے محبت تھی یا ہے اور تم چاہتی تھیں یا چاہتی ہو کہ اُن کی شریکِ زندگی ہو جاؤ۔ تو میں ہر امکانی کوشش تم دونوں کے ملانے کے لئے کروں گی۔ جہاں تک اس معاملہ میں میرا تعلق ہے میرا اصول یہ ہے کہ زندگی بھر سہیل خوش رہیں اور میں اُنہیں ہمیشہ خوش دیکھتی رہوں۔

میں نے یہ خط بلا جبر و اکراہ اپنی مرضی اور خوشی سے لکھا ہے مجھے یقین ہے کہ تم مجھ اجنبی کو ان سطور کے بآزادی لکھنے کی معافی دو گی۔ لیکن معاملہ کی نزاکت و اہمیت کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ تم میری نیت کی تعریف کرو گی۔

میں تمہارے لئے زیادہ سے زیادہ مسرت کی طالب ہوں۔ خدا تمہیں برکت دے۔

سچ مچ تمہاری ۔۔۔۔

مسز فاطمہ سہیل

برلن۔ ۳۰ مئی ۱۹۳۲ء

پیاری مسز سہیل۔

کیا مجھے اجازت ہے کہ میں بار بار تمہارے اُن محبت بھرے الفاظ کا شکریہ ادا کروں جو تم نے مجھے لکھے ہیں میں تمہارے اس خط کو ہمیشہ اپنے سینہ سے لگائے رکھوں گی بحیثیت ایک بشری اور انسانی مہربانی اور لطف کے ثبوت اور

اور نشان کسی میں تم نے بحیثیت اس کی کہ تم سہیل کی بیوی ہو ضرور تمہاری عزت کرونگی تم جانتی ہو ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اس لئے تم سمجھ سکتی ہو کہ ہماری یہ خواہش کتنی شدید ہو سکتی ہے کہ ہم دونوں سلک ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔ میں جانتی ہوں کہ تم اپنا خاوند اور اپنے بچے کا باپ مجھے دیدینے کا ارادہ کرکے کتنی بڑی قربانی کر رہی ہو۔ اور یہ وہ قربانی ہے کہ اس سے بڑی قربانی عورت ذات سے مشکل ہے۔ مگر میں خیال کرتی ہوں کہ مجھ سے اتنی بڑی قربانی نہیں ہو سکتی جتنی بڑی قربانی کے لئے تم تیار ہو۔ سہیل نے اکثر تمہارے متعلق مجھ سے باتیں کی ہیں۔ تمہیں یقین ہونا چاہئے کہ میں اُن سے اپنے پورے دل سے محبت کرتی ہوں اور میں ہمیشہ اس کی کوشش کرتی رہوں گی کہ اپنی بہترین متاع اُن کی شادمانی پر نچھاور کردوں اور یہ خواہش وہ ہے کہ جس میں تم اور میں دونوں ایک دوسرے سے متفق ہیں۔ لیکن بات ایسی آسان نہیں اور ابتداءً خواہ کچھ ہو مگر یہ مسرت قائم نہیں رہے گی۔ کیونکہ ہم نے بالکل مختلف اور متضاد ماحول اور فضاؤں میں پرورش پائی ہے۔ اگرچہ یہاں محبت کا معاملہ ہے اور یہی اصلی چیز ہے لیکن سہیل کے لئے یہ بہت مشکل ہوگا کہ وہ آئندہ مشکلات سے دوچار ہوں جبکہ گرد و پیش کے لوگوں میں سے کوئی اسے سمجھ سکنے کی کوشش نہ کرتا ہو جیسا کہ تم اسے سمجھتی ہو قبل اس کے کہ میں مکرر سہ کرر تمہارا شکریہ ادا کروں مجھے پختہ امید ہے کہ کبھی ذاتی طور پر تمہارے سامنے آکر شکریہ ادا کروں گی۔

میں دُعا کرتی ہوں۔ کہ خدا تمہیں کوئی بہت بڑی خوشی دکھائے اور مجھے ہمیشہ اس سے خوشی حاصل رہیگی اگر میں آئندہ تمہاری بہتری کے لئے کوئی خدمت بجا لاسکوں۔

میری بہترین خواہشات تمہارے اور تمہارے بچے کے لئے ہیں۔

تمہاری غزال

کیا یہ محبت کے ایثار نہیں ہیں اور ان سے ظاہر نہیں ہوتا کہ عورت عورت ہی ہوتی ہے چاہے وہ مشرق میں پیدا ہو یا مغرب میں، اور عورتیں محبت کے ثبوت میں ایسا بھی کیا کرتی ہیں، اور محبت میں یوں بھی ہوا کرتا ہے!

اب میری حالت کیا ہے؟ صحیح طور پر تو کچھ عرصہ کے بعد ہی کہہ سکوں گا۔

مہر محمد خاں شہاب (مالیرکوٹلوی)

موسمِ برشگال کا ایک دن

رُخِ روشن فضا نے جانبِ صحنِ چمن بدلا ۔۔۔ سحر کا نور پھیلا ہر طرف دورِ کہن بدلا
نسیمِ صبح نے ہلکا سا مشکیں پیرہن بدلا ۔۔۔ بہ فیضِ موسمِ گل سرو بدلا یاسمن بدلا

یہ موقع ہے اٹھائے نرگسِ بیمار بھی آنکھیں
پئے نظّارہ کھولیں صاحبِ آزار بھی آنکھیں

سیہ بادل وہ بحرِ ہند سے پی کر شراب آیا ۔۔۔ ہمالہ سے وہ ٹکّر کھائی یہ با آب و تاب آیا
اٹھا اک شور برساتا ہوا موتی سحاب آیا ۔۔۔ گل و شاخِ خزاں دیدہ پہ پھر جا کر شباب آیا

تنِ بے جاں میں خونِ زندگی کی آگئیں لہریں
زمینِ تشنہ پر دریا ہے ۔ جاری ہوئیں نہریں

پرے بگلوں کے ہیں اودی گھٹا میں "نور کی موجیں" ۔۔۔ حسیں ہنسوں کی ڈاریں بادلوں میں "برق کی لہریں"
لووں کے جگمگھٹے ابرِ سیہ میں "ضو فگن کرنیں" ۔۔۔ ہوا میں صف بہ صف مرغابیاں "شانہ شدہ زلفیں"

ہر اک حسّاس کے دل پر ہے فیضِ سرمدی طاری
کسی پر اب نہیں چلتا فسونِ ہیچ مقداری

چمن میں منعقد بزمِ سرور و عیش پاتے ہیں ۔۔۔ شگوفے بن کے گل سرمایۂ نکہت لٹاتے ہیں
طیورِ خوش نوا آزادیوں کے گیت گاتے ہیں ۔۔۔ لبِ جو مطربانِ خوش گلو تانیں اڑاتے ہیں

ہوئے بیدار پھر پردے سرودِ بزمِ راحت کے
ہوئے ہشیار پھر نغمے ربابِ سازِ بہجت کے

ہوا پھر گلبنِ پژمردہ معمورِ گل و غنچہ ۔۔۔ چمن کا گوشہ گوشہ پھر ہے مسطورِ گل و غنچہ

زباں پر آ گیا کانٹوں کے مذکورِ گل و غنچہ　　　ہوئی پھر عندلیب زار مسحورِ گل و غنچہ

گھٹا کے ساتھ مے خانے کو ہر دل تنگ چلتا ہے

کہ اس موسم میں دورِ ساغرِ گلرنگ چلتا ہے

مگر وہ جس کی قسمت نے کوئی حسرت نہ کی پوری　　　بہاروں سے طلب کرتا ہو احساسات مہجوری

مگر وہ جس کی عادت بن گئی ہے یاس و مجبوری　　　ہوا ہے، اور ہو گا روشناس زحمتِ دوری

بڑھا کرتے ہیں اُس کے رنج بیبرِ موسمِ گل سے

فزوں ہوتی ہے الجھن دل کی دورِ ساغرِ مل سے

وہ جس کو اک مصیبت ہی بہاروں کی دل آویزی　　　وہ جس کو گریۂ پیہم ہے بادل کی گہر ریزی

وہ جس کو اک قیامت ہی گل نورس کی نوخیزی　　　وہ جس کو خونِ حسرت ہی شفق کے رنگ کی تیزی

یہاں وہ سے ہے جس جانب اشارہ، کون ہی میں ہوں

وہ اے شادِ حزیں فرقت کا مارا کون، ہی میں ہوں

شاد عارفی (رامپوری)

جھولا

پروا سنکی بادل چھائے　　　بھورے کالے گھر گھر آئے

ساون کی گھنگھور گھٹائیں

امرت جل بھر بھر کر لائے

آؤ سہیلی جھولا جھولیں

برکھا کی امرت ورشائیں

برکھا رت کی شان نرالی　　　پتے پتے پر ہریالی

آؤ سہیلی جھولا جھولیں

ڈالی ڈالی ہے متوالی

اُمڈی ہیں پُرشور گھٹائیں　　　کالی کالی چوگھٹائیں

اس رُت کی مخمور فضائیں

ساون کی گھنگھور گھٹائیں

آؤ سہیلی جھولا جھولیں

جھولیں اور پکوان پکائیں　　آموں کا نوروز منائیں
کھاتے جائیں گاتے جائیں

جھڑی لگی ہے آس برکھا ہیں
آؤ سہیلی جھولا جھولیں

کھیلیں کودیں اچھلیں تیریں　　باغ کی نہر میں مل کر پیریں
برکھا رُت کی دیکھیں سیریں

ٹھنڈی ٹھنڈی مست ہوائیں
آؤ سہیلی جھولا جھولیں

اودی اودی ساری لائیں　　پھر دھانی چنری رنگوائیں
دھنک کمان سے رنگ ملائیں

تُل کر اپنے حسن و ادا ہیں
آؤ سہیلی جھولا جھولیں

تاجور

برسات

وہ فوج کالی کالی پورب سے آ رہی ہے　　رحمت کا شامیانہ دنیا پہ چھا رہی ہے
لاکھوں کرشمے اپنے بجلی دکھا رہی ہے　　پانی برس رہا ہے دنیا نہا رہی ہے
باجا سا بج رہا ہے دنیائے آسماں میں　　یا جشن ہو رہا ہے میدانِ لامکاں میں
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چکر لگا رہے ہیں　　بادل گرج رہا ہے افلاک گا رہے ہیں
اشجار وجد میں ہیں نالہ اُبل رہا ہے　　آبادیوں میں ہر سو پرنالہ چل رہا ہے
دریا پہ مینڈکوں نے غوغا مچا رکھا ہے　　اندر سبھا ہے قائم طاؤس ناچتا ہے
بل کھا کے اپنا گانا قمری سنا رہی ہے　　صحرا سے "پی کہاں!" کی آواز آ رہی ہے

برسات کا یہ موسم پانی کی یہ روانی
ہے رحمتِ خدا سے دنیا کی زندگانی

سید مقبول حسین (احمد پوری)

اگست کے آخری دن تھے ...... خزاں آرہی تھی۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اچانک، گرجے چمکے بغیر بارانی کا ایک جھالا ہمارے میدان پر برستا ہوا گزر گیا۔

گھر کے سامنے باغ کے دُھلے ہوئے درختوں میں سورج کی آخری شعاعوں نے ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔ وہ گول کمرے میں اپنی میز کے پاس بیٹھی تھی اور نیم وا دروازے میں سے اپنی خواب آلود آنکھوں سے مسلسل باغ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں جانتا تھا کہ اُس کے دل میں اِس وقت کونسا خیال ہے، میں جانتا تھا کہ ایک مختصر سی مگر درد انگیز کشمکش کے بعد وہ اِس وقت اُس جذبے سے مغلوب ہو گئی ہے جسے وہ اب اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتی۔

یکایک وہ اُٹھی، تیزی سے باہر باغ کی طرف چل دی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

ایک گھنٹہ گزر گیا ..... پھر دوسرا! وہ واپس نہ آئی۔

اب میں بھی اُٹھا، اور گھر سے نکل کر اُس روش پر چلنے لگا جس پر سے وہ گزری تھی۔ اگرچہ جاتے ہوئے میں نے اُسے دیکھا نہ تھا، لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ اسی راستے سے گئی ہے۔

میرے آس پاس تمام اندھیرا چھا رہا تھا، اب رات ہو چکی تھی۔ لیکن روش کی گیلی گیلی ریت پر کوئی گول گول سرخ سرخ چیز پڑی ہوئی رات کے دھندلکے میں بھی نظر آرہی تھی۔

میں نے جھک کر دیکھا۔ یہ گلاب کا ایک تازہ اور نوشگفتہ پھول تھا۔ اب سے دو گھنٹے پہلے میں نے یہی پھول اُس کے سینے پر لگا ہوا دیکھا تھا۔

میں نے اس پھول کو کیچڑ پر سے نہایت احتیاط کے ساتھ اُٹھا لیا، اور گول کمرے میں جا کر اس کی میز پر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ آگئی، اور نہایت سبک رفتار کیساتھ سارے کمرے کو طے کر کے اپنی میز کے پاس جا بیٹھی۔

اس کا چہرہ اب پہلے سے زیادہ زرد اور زیادہ روشن تھا؛ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں جو اب پہلے سے کچھ چھوٹی نظر آرہی تھیں پُر مسرت گھبراہٹ میں جلدی جلدی اِدھر اُدھر حرکت کرنے لگیں۔

اُس نے گلاب پر ایک نگاہ ڈالی، پھر اسے اُٹھا کر [illegible] ایک نگاہ ڈالی؛

اور اس کی آنکھیں جو اب یکایک مجھ پر جم گئی تھیں آنسوؤں سے روشن ہوگئیں۔

میں نے کہا "تم کیوں رو رہی ہو؟"

اس نے جواب دیا "آہ، اس گلاب کو دیکھو۔ اس کا کیا حال ہوگیا ہے"!

اس پر مجھے ایک بلیغ فقرہ کہنے کا خیال آیا۔ میں نے معنی خیز انداز سے کہا "تمہارے آنسو اس آلائش کو دھو ڈالیں گے"۔

اُس نے کہا "آنسو دھوتے نہیں وہ جلا ڈالتے ہیں" اور آتشدان کی طرف مڑ کر اُس نے گلاب کو بجھتے ہوئے شعلوں میں ڈال دیا۔ پھر جوش کے ساتھ کہنے لگی "آگ آنسوؤں سے بھی بڑھ کر جلانے والی ہے" اور اس کی خوبصورت آنکھیں جو ابھی آنسوؤں سے چمک رہی تھیں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

میں نے دیکھا کہ وہ بھی ایک آگ میں جل رہی تھی۔

کیسے خوبصورت کیسے شاداب تھے گلاب کے پھول

بہت عرصہ ہوا میں نے کبھی کہیں ایک نظم پڑھی تھی۔ یہ جلد ہی بھول گئی...... لیکن پہلا مصرع میرے ذہن میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگیا۔

کیسے خوبصورت، کیسے شاداب تھے گلاب کے پھول

اب سردی کا موسم ہے، کھڑکیوں کے شیشوں پر پالا جم گیا ہے، تاریک کمرے میں تنہا ایک بتی جل رہی ہے۔ میں ایک گوشے میں دبکا بیٹھا ہوں اور میرے دل میں بار بار یہ مصرعہ گونج رہا ہے۔

کیسے خوبصورت، کیسے شاداب تھے گلاب کے پھول

پھر میں اپنے آپ کو روس کے ایک دیہاتی مکان کی نیچی سی کھڑکی کے سامنے پاتا ہوں۔ بہار کی شام آہستہ آہستہ رات میں تبدیل ہو رہی ہے۔ خوشگوار ہوا کھٹّوں اور سنگتروں کے پھولوں سے مہکی ہوئی ہے، کھڑکی میں ایک نوجوان لڑکی اپنا سر اپنے کندھے پر جھکائے ایک بازو پر جھکی بیٹھی ہے اور خاموشی کے ساتھ ٹکٹکی باندھے آسمان کی طرف دیکھ رہی ہے، گویا نئے ستاروں کے نکلنے کا انتظار کر رہی ہے۔ اُس کی خواب انگیز آنکھوں میں کیسی

پاکیزگی ہے، کیسا سحر ہے، اس کے ہونٹوں پر جو متفسرانہ انداز میں کھلے ہوئے ہیں کیسی معصومیت کھیل رہی ہے، وہ اُٹھتا ہوا نادیدہ آزار سینہ کس سکون کے ساتھ سانس لے رہا ہے، کتنا معصوم اور نازک ہے اس کے نوخیز چہرے کا ایک رخی نقشہ! مجھے اس سے بولنے کی جرأت نہیں ہوتی، مگر مجھے اس سے کتنی محبت ہے، میرا دل کس طرح دھڑک رہا ہے!

کیسے خوبصورت، کیسے شاداب تھے گلاب کے پھُول

کمرے میں اندھیرا چھائے جا رہا ہے...... شمع دھیمی دھیمی جل رہی ہے اور بہے جا رہی ہے، رقصاں سائے نیچی چھت پر لرز رہے ہیں، باہر پالے کی بے دردانہ کڑکڑاہٹ اور اندر بڑھاپے کی اُداس آوازیں سُنائی دے رہی ہیں۔

کیسے خوبصورت، کیسے شاداب تھے گلاب کے پھُول

شمع ٹمٹماکر بجھ جاتی ہے...... یہ بھاری اور کھوکھلی آواز سے کون کھانس رہا ہے؟ میرا بوڑھا کتا میرا تنہا رفیق سمٹ سمٹا کر میرے پاؤں میں بیٹھا کانپ رہا ہے...... مجھے سردی لگ رہی ہے...... میں ٹھٹھر رہا ہوں...... اور وہ سب مر چکے ہیں...... مر چکے ہیں......

کیسے خوبصورت، کیسے شاداب تھے گلاب کے پھُول

منصُور احمد

تاج

چاندنی رات میں

چاندنی رات کا سماں تاج کا منظر حسیں
چھائی ہوئی ہیں مستیاں کیفیتوں کا دَور ہے

قلزم نور چاندنی کشتیٔ نور تاج گنج
نور میں نور مل گیا تاج نہیں کچھ اور ہے

اختر انصاری

فلسفۂ حیات

(۱)

اے حادثِ فانی، نادان کو سمجھا بھی ہے
سادہ بھی ہے یہ قول، معمّا بھی ہے
لابد ہے عدم، تو زندگی بھی لابد
مرنا ہے ہر ایک کو، تو جینا بھی ہے

(۲)

رکھ یاد یہ کارخانۂ قدرت کا
یہ دارِ فنا نہیں، یہ ہے دارِ بقا
ہاں دیکھا ہے تخم گرا مٹی میں
پھر پھیلا اس سے کیا ہوا ایک پیڑ

(۳)

مانا کہ بلند مائل پستی ہے
مانا کہ زمانے کے لئے پستی ہے
مانا کہ اجزا ہے جان فنا
گر غور کرے نیستی ہی تو ہے جان
مستی سے عدم کی جان میں ہستی

(۴)

دنیا کو غلط ہے دارِ فانی کہنا
ہر چیز کو اس کی آنی جانی کہنا
ہوتا ہے تو کیا جواں آنی نہیں
تمہ ریشہ ہے اٹھتے جوانی کہنا

[illegible] سیفی

دیہاتی گیت

کوئی پندرہ سال بعد اس سال میں اپنی ننھیال گیا۔ میرے ماموں زاد بھائی کی شادی تھی۔ اُس علاقے میں دستور ہے کہ ندھاری[1] برات سے ایک روز پہلے اور خاص خاص رشتہ دار تین چار دن پہلے بیاہ والے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ میں چونکہ عدیم الفرصت تھا۔ بارش کی وجہ سے راستے بھی خراب ہو رہے تھے۔ اس لئے پہلے تو نہ پہنچ سکا۔ البتہ برات سے ایک دن پہلے وہاں جا پہنچا۔

اُس دن تنبول پڑ رہا تھا اور شام تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ میرے ذمہ تنبول لکھنے کی خدمت لگائی گئی۔ اس لئے میں رات گئے تک بھی گھر میں جا نہ سکا۔

روٹی سے فراغت پائی تو اندر سے بُلاوا آیا۔ ایک تو وہاں گئے پندرہ سال ہو چکے تھے۔ مکانوں میں کچھ رد و بدل ہو گیا تھا۔ دوسرے اُس وقت کی لڑکیاں عورتیں، اور اُس وقت کی مائیں دادیاں بن چکی تھیں۔ پھر صحن میں عورتوں اس قدر ہجوم کہ نگاہیں اُلجھ گئیں۔ بہزار دقت اس ہجوم کو چیرتا ہوا دالان تک پہنچا۔ بڑی بوڑھیوں کی دعائیں لیں۔ نئی پود سے جان پہچان پیدا کی۔ اور کچھ بیاہ برات کے متعلق ہدائتیں لیکر باہر چوپال میں آ بیٹھا۔

اِتنے میں ڈھولک کسنے کی آواز آئی۔ اور تھوڑی دیر بعد گت بجنے لگی۔ مجھے کچھ تکان کی وجہ سے، کچھ دن بھر مصروف رہنے کی وجہ سے اُونگھ سی آ رہی تھی۔ لیکن جب سہاگنوں نے سہاگ گانا شروع کیا۔ تو نیند اُچاٹ ہو گئی۔

ایک گیت ہوا، پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ رات بھر یہ سلسلہ قائم رہا۔ اور صبح جس وقت تک کہ دُولہا کو بنا سنوار کر گھر سے رخصت نہ کر دیا۔ گانا برابر ہوتا رہا۔ مجھ پر ان گیتوں کا جس قدر اثر ہوا۔ شاید ہی ایسا اثر میری طبیعت نے کبھی لیا ہو۔ گیت کیا تھے وجد و کیف کی میٹھی میٹھی لہریں تھیں جو کانوں کے راستے دل میں اُتری جاتی تھیں۔

میں نے محسوس کیا۔ کہ ہماری رسمی شاعری میں وہ بات کہاں جو ان گیتوں میں ہے۔ اور دیر تک سوچتا رہا۔ کہ آخر ہمارے شاعر شعر کس کے لئے کہتے ہیں؟ میں نے اُردو شاعری کا ایک سرسری جائزہ لیا۔ تو اُردو کی کوئی چیز اس بزم نشاط میں شامل ہونے کے قابل نظر نہ آئی۔ اُردو کی غزلیں سراسر بناوٹ اور تکلف۔ بیباکانہ عشق کا اظہار۔ جنہیں سنکر گنوار دل کی معصوم

---

[1] نیوت دھاری (یعنی وہ لوگ جو نیوتہ (تنبول) دینے کے لئے بیاہ میں شامل ہوتے ہیں) کثرتِ استعمال سے ندھاری رہ گیا۔

اور عفت مآب کنواریاں اور سہاگنیں کٹ کٹ جائیں۔ گیت اُردو میں ہیں کہاں ؟ اگر دو چار دس گیت ہیں بھی تو وہ بھی غزلوں کے دُم چھلّے، ہماری معاشرت سے ہماری شاعری کو دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ ہمارے کسی شاعر کی چیز بے تکلفی اور آسانی سے ان مقدس اور رنگین مجمعوں میں نہیں گائی جا سکتی۔

اُردو غزل کے دیہاتی موسیقی میں بار نہ پانے کی وجہ زبان کا اختلاف نہیں۔ بلکہ موضوع کا اختلاف ہے۔ اُردو غزل میں بالغ مرد اپنے محبوب سے باتیں کرتا ہے۔ جس کا ہماری عملی زندگی میں کوئی وجود نہیں۔ ہمارے ہاں بچپن کی شادی اس موضوع کا امکان ہی پیدا نہیں ہونے دیتی۔ کہ کسی مرد کو محبت کی تشنگی محسوس ہو۔ ہندوستان کے ہر شاعر کو بلا استثنائے[1] چند دیکھ لیجئے۔ ایک طرف تو اپنی غزلوں میں محبوبِ خیالی کی فرقت میں روتا ہے۔ دوسری طرف چند بچوں کا باپ بھی ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات دو بیویوں کا خاوند بھی۔ شاعری میں تقلید کی حد سے بہت کم باہر نکلتا ہے۔ اس کی شاعری ایک خاص طبقے سے داد لے سکتی ہے۔ یا چند الماریوں میں بند رہتی ہے اور بس! زیادہ ہوا تو اربابِ نشاط نے ذرا گرمیٔ محفل کا سامان بہم پہنچا دیا غور کیجئے کہ اس طرح ہمارے شاعروں کی زندگیاں اور ان کی وہ شاعری جو حسن و محبت کی ترجمان کہلاتی ہے۔ کتنی بے مصرف ثابت ہوتی ہے۔

میں ایک طرف جہاں رات بھر گیتوں کے رس سے لطف اندوز ہوتا رہا دوسری طرف اپنے ناکارہ پن پر جی ہی جی میں کُڑھتا رہا۔ کہ میں بھی شاعر ہوں۔ چند مذاقِ شعر رکھنے والے اصحاب کے ذہنوں سے باہر میرا بطورِ شاعر کوئی وجود نہیں۔ کاش میرے گیت اِسی بے تکلفی سے گائے جاتے۔ میرے دل سے نکلی ہوئی صدائیں عوام کی زبانوں پر ہوتیں۔ اور ایسے جلسوں میں رنگ پیدا کرتیں۔

کم سنی کی شادی کے باوجود ہندوستان کے گرہست میں جو رس ہے وہ دنیا کے کسی حصے میں نہیں۔ محبت کے جذبات اُبھرنے سے پہلے محبوب کا مل جانا کس حد تک محبت آفریں ہے اسے کسی ہندوستانی کی نہیں بلکہ ایسے شخص کی زبان سے سُنیئے جو ہندوستان میں اپنے لئے کوئی دلچسپی نہیں پاتا اور ہر قدم پر اپنے قومی اور وطنی تعصب کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یعنی شیخ علی حزیں کہتا ہے ؎

چوں زنِ ہندی کسے در عاشقی دیوانہ نیست
سوختن بر شمعِ مُردہ کارِ ہر پروانہ نیست

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ غزل ہی حسن و محبت کی ترجمان ہے۔ قدیم ہندی گیت جس قدر محبت کی سچی ترجمانی کرتے ہیں۔ میرے خیال میں دنیا کی کوئی زبان اس معاملے میں ان کی حریف نہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستانیوں کی زندگی میں شعریت

[1] وہ بھی اس لئے کہ سماجی بندشوں۔ خاندانی حالات۔ یا کسی خاص وجہ سے اس کی شادی نہ ہو سکی ہو۔

پیدا ہوگئی تھی۔ اور "ستی" کا رواج اور "آواگون" کا مسئلہ اسی شعریت کی پیداوار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غزل کو شاعری میں خواہ کتنا ہی بلند درجہ دیا جائے وہ ہندوستانیوں کے جذباتِ محبت کی محرم نہیں کہلا سکتی۔ نہ وہ ہندوستانی معاشرت میں بار پاسکتی ہے۔ شہروں کو چھوڑ کر دیکھئے کہ ہندوستان میں (جو سات لاکھ دیہات کے مجموعے کا نام ہے) کتنی غزلیں گائی جاتی ہیں؟

وہ لوگ جو "غزل پرست" ہیں۔ ذرا صورتِ حالات کے اس پہلو پر بھی غور کریں۔ وہ لوگ جو اردو کو تمام ملک کی مشترکہ زبان بنانے کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں۔ ذرا اگریبان میں منہ ڈال کر جھانکیں کہ دیہاتیوں کے لئے "گل وبلبل"۔ "زرکِ شیراز"۔ "خیالی محبوب" "محبوب کے ستم"۔ "محبوب کے انداز" اور "محبوب کے خیالی اعضا" کتنی اہمیت اور جاذبیت رکھتے ہیں۔

اردو شاعری کا رخ جب تک دیہات کی جانب نہیں ہوتا۔ میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہندوستان کی زبان نہیں بن سکتی اور مجھے یقین ہے کہ ایک دن ہندی اردو سے اس معاملے میں سبقت لے جائیگی۔

اردو کے متعلق حروف وہجا کی مشکلات کا حل سوچا جاتا ہے۔ اسے ٹائپ میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسے غیر زبانوں کے ملاپ سے محفوظ رکھنے کے طریقے سوچے جاتے ہیں۔ اس کی املا انشا پر بحث ہوتی ہے۔ لیکن افسوس کہ اس کے طریقِ استعمال پر کبھی غور نہیں کیا جاتا۔

کتنے افسوس اور غضب کی بات ہے۔ کہ ہندوستان جو یکسر زراعتی ملک ہے۔ اس کی اُس زبان میں جسے تمام ملک کی مشترکہ زبان بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ آلاتِ زراعت کے لئے نام نہیں ہیں۔ نباتات کے لئے نام نہیں ہیں۔ دوسرے درجے پر ہندوستان تجارتی ملک ہے لیکن اردو میں تجارتی اصطلاحیں برائے نام ہی ہیں۔ اور شاید نہ ہونے کے برابر۔

میں نے اپنے طور پر کئی ایسے ادیبوں سے اردو کی اس بے مائگی کا ذکر کیا۔ تو جواب ملا کہ "اردو شریفوں کی زبان ہے۔ گنواروں اور بنیوں کی زبان نہیں"۔ فرمائیے! یہ جواب کس حد تک اردو کے ہندوستان گیر ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ ایک مجلس میں میرے چند فاضل دوست تشریف رکھتے تھے۔ اور

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

کے یقین کی روشنی میں اردو کی ترویج ودوسعت پر خوب خوب بحث کر رہے تھے۔ میں چپ چاپ ایک طرف بیٹھا تھا۔ یہ حضرات جب کبھی میری جانب کسی تائیدی اشارے کی طلب میں دیکھتے تو میرا دل ہنستا۔ آخر انہوں نے اپنی عالمانہ بحث کے دوران میں مجھ گنوار کو درخورِ اعتنا نہ سمجھ کر میری جانب دیکھنا ہی بند کر دیا۔

ایک صاحب بولے۔ کہ بھئی کچھ کہو نا آخر! یہ چپ کیوں سادھ لی۔ میں نے عرض کیا کیا کہوں۔ میری سمجھ میں تو ایک بات بھی نہیں آئی۔ میں نے کہا۔ کہ جب تک اُردو میں عوام کا محرم بننے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوگی۔ اُس وقت تک آپ کی بحثیں بیکار ہیں۔ اُنہوں نے فرمایا یعنی ـــــ ؟ میں نے عرض کیا جب چنے اور گیہوں ملے ہوئے ہوں تو اُنہیں دو طرح سے الگ کیا جاتا ہے ایک تو چھرنے کے ذریعے ایک چھاج کے ذریعے۔ فرمائیے تو پہلے اور دوسرے عمل کو اُردو میں کیا کہیں گے ؟ جواب کچھ نہ تھا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ ترازو کی ڈنڈی پر وہ چیز جسے پکڑ کر تولتے ہیں۔ اُس کا اُردو میں کیا نام ہے ؟ جواب پھر بھی کچھ نہ تھا۔ اب میں نے جسارت سے کام لیکر عرض کیا۔ کہ حضرت جس زراعتی ملک کے باشندوں کو ادائے مطلب کے لئے اُردو میں لفظ نہ ملیں وہ اس اُردو کو لے کر چاٹیں گے کیا ؟ آپ حضرات کی کوششوں سے اُردو زیادہ سے زیادہ علمی زبان بن جائے گی۔ لیکن ملکی زبان نہیں بن سکتی۔ اگر اس دعوے کو غلط سمجھا جائے تو ایک اُردو مقدمے کی مسل جس کے فریقین دیہاتی ہوں رہتک کے ضلع سے اور دوسری زیادہ دور نہیں منٹگمری کے ضلع سے منگا کر دیکھ لیجئے۔ کہ دونوں میں آپ کو کتنے الفاظ ایسے ملیں گے جن کے مترادف الفاظ جج صاحبان کو اُردو میں نہیں مل سکے۔ اور اُنہوں نے مجبوراً مقامی اصطلاحیں استعمال کیں +

اس کے بعد گفتگو کا موضوع بدل گیا اور کچھ دیر کے بعد جلسہ برخاست! میں اپنے موضوع سے بہت دُور نکل گیا ہوں۔ دراصل " دیہات میں اُردو " ایک مستقل عنوان ہے۔ جس پر اب تک بحث نہیں ہوئی۔ اور اگر یہ بحث شروع ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ اُردو کس طرح ملکی زبان بنتی ہے۔ اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

دیہاتی گیتوں میں محبت مرکزی خیال کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس کا جذبہ شدید نہیں ہوتا۔ بلکہ نہایت لطیف، اور گیتوں کے موضوع کا تنوّع شدت پیدا نہیں ہونے دیتا۔ گیت سنتے وقت محبت کے جذبات اُبھرتے ہیں لیکن وہ انسان کو بیخودی کی طرف نہیں بلکہ سرور کی طرف لے جاتے ہیں۔ دل میں کوئی میٹھی میٹھی چٹکیاں لیتا ہے۔ رسم ورواج کی طرف ہلکے ہلکے اشارے۔ شکر رنجی اور طنزِ لطیف کی چاشنی، جذبات کی صداقت اور بیان کی بے تکلفی ایک گیت میں وہ لطف پیدا کرتی ہے کہ انسان کی رُوح وجد میں آجاتی ہے۔

دُولھا کو مہندی لگ رہی ہے اور گیت گایا جا رہا ہے۔

ہاتھ سنٹی بنّے پھولوں کی۔ بنّا باغوں سے آیا ‏ ‏ آرے بنّے میرے لاڈلے۔ تجھے رنگ رچا دُوں

آگے گھوڑا تیرے بابل کا۔ پیچھے امّاں کا ڈولا ‏ ‏ بیچ میں ڈولا راول زادی کا۔ موتی جھالر لائے

دُولہا گھر سے رخصت ہوتا ہے :-

تو چڑھ بنّے گھوڑی، تیرا باپ پڑھے لکھ پال — واری جاؤں یہ رنگ رچا بنّا ۔ سہرا بندھا

دولہا کم سن ہے ۔ ماں سے پوچھتا ہے ۔

میں تو اماں اکیلا ہوں ۔ کیسے چڑھونگا برات

ماں جواب دیتی ہے ۔

کیوں رے بچے تو اکیلا کیوں ۔ تیرے بھائی بھتیجے سات — واری جاؤں یہ رنگ رچا بنّا ۔ سہرا بندھا

برات چڑھتی ہے ۔ گیت گایا جا رہا ہے ۔

کیدھر کے دَل اُمڈے کیدھر برسن ہار بھلے — ...... کے دَل اُمڈے ...... برسن ہار بھلے

...... ایسا بکھیر بکھیر نا جیسے کسُم کے بیج بھلے — وام سمجھنا ٹھیکرے ۔ بول رہیں دن جائیں چلے

یا اُتریں گے باغ میں یا سمدھن کی سیج بھلے — یا کھائیں گے تھال میں یا سمدھن کی گیل بھلے

دیکھ کے سمدھن ڈر گئی کون آئے فوجدار بھلے — نہ ڈر سمدھن نہ ڈر ۔ بہوؤں کے لیون ہار بھلے

اس گیت کے دوسرے مصرعہ میں جہاں نقطے ہیں وہاں پہلے دولہا کے گاؤں کا نام لیتے ہیں پھر دلھن کے گاؤں کا۔ تیسرے مصرعہ کے نقطوں کی جگہ اُس چودھری یا بزرگ کا نام ہوتا ہے ۔ جو بیٹے والوں کا مانا بندہ ہوتا ہے اور بکھیر وغیرہ کرتا ہے ۔ اِس گیت میں ہلکی سی سیٹھنی بھی ہے ۔

برات گاؤں میں پہنچتی ہے ۔ استقبالیہ گیت شروع ہوتا ہے ۔

سر بنّے کے پگڑی سہائے ۔ سہرے کی عجب بہار
بنّا میرا موٹر میں آیا
بنّی کا ہے گھر دُور ۔ بنّا میرا موٹر میں آیا
آنکھ بنّے کے سرمہ سہائے ۔ کاجل کی عجب بہار
بنّا میرا موٹر میں آیا
ہاتھ[1] بنّے کے مہندی سہائے ۔ چھڑی کی عجب بہار
بنّا میرا موٹر میں آیا
ساتھ بنّے کے ڈولا سہائے ۔ بنّی کی عجب بہار
بنّا میرا موٹر میں آیا

[1] اس طرح تمام سراپا بیان کرکے آخر کا مصرعہ گایا جاتا ہے ۔

ایک گیت دولھن کی طرف سے ترجمان ہوکر گایا جاتا ہے۔ دیکھئے کتنا دلچسپ گیت ہے۔ ہندوستانی لڑکی اپنے فرائض خانہ داری کے احساس کا اظہار کس لطیف اور ترغیب آموز پیرائے میں بیان کرتی ہے۔

کس سنگ بیاہنے آیا رے بنّے — گھر رکھوالی کون چھوڑی رے بنّے

تو باوا سنگ بیاہنے آیا رے بنّے — گھر رکھوالی اماں چھوڑی رے بنّے

وہ تو کھائے لٹائے پھوہڑی لائے رے بنّے — میں تو جوڑوں سنگوڑوں تھوڑا کھاؤں رے بنّے

میرا جلدی سے ڈولا کسوا نا رے بنّے — مجھے جلدی وداع کروانا رے بنّے

اِس گیت کا دوسرا مصرعہ بدل بدل کر تمام رشتہ داروں کے نام لئے جاتے ہیں اور دولھن کی طرف سے سب پر بے اعتمادی ظاہر کی جاتی ہے۔ اس گیت میں بھی کسی قدر سیٹھنی (سمدھنوں سے مذاق) ہے۔ ورنہ عام طور پر ہندوستان میں بہو ساس کی بہت خدمتگزار ہوتی ہے۔

ایک گیت اور دولھن کی ترجمانی میں گایا جاتا ہے۔ اِس سے اُس کے کفایت شعارانہ اور گھر کے رکھ رکھاؤ کے سلیقے کا پتہ چلتا ہے۔ عام طور پر اُدھر یہ دستور ہے۔ کہ جب بچّہ پیدا ہوتا ہے۔ تو نند بھاوج کی خدمت کرتی ہے۔ اور اسے معاوضہ میں مقدور کے مطابق نیگ لاگ دیا جاتا ہے۔ دیورانی جٹھانی بھی اِس تقریب میں شامل ہوتی ہیں۔ اور پکانا ریندھنا اِن دنوں ساس کے ذمے ہوتا ہے۔ دولھن خاوند سے کہتی ہے ؎

میں تو درد سے ہوں دیوانی سنوریا

نند میری کو خبر مت کرنا — وہ نیگ لاگ بہت بتاوے

میں درد سے ہوں دیوانی سنوریا

ساس میری کو خبر مت کرنا — وہ چھوچھی[1] میں پانی ملاوے

میں درد سے ہوں دیوانی سنوریا

جٹھانی میری کو خبر مت کرنا — اگر نگر میں کہہ آوے

جہیز دیتے وقت کا گیت ملاحظہ ہو۔

میرا بچّہ نادان بنّا کیا کچھ مانگے ری — سونے کا چھلّا رومال مانگے ری

میرا بچّہ نادان بنّا کیا کچھ مانگے ری — بنّا مانگے ابٹن اور نائن مانگے ری

میرا بچّہ نادان بنّا کیا کچھ مانگے ری — بنّا مانگے چوکی اور ترکھانی مانگے ری

[1] زچہ کی خوراک۔

لڑکا نادان ہے۔ سمدھنوں سے سمدھنوں کا مطالبہ ہے کہ اسے ابٹن دو تو نائن ساتھ دینا۔ چوکی دو تو کھانی ساتھ بھیجنا۔ عام طور پر سمدھیوں کے گاؤں کی ہر عورت کو سمدھن سمجھ کر اُن سے مذاق کیا جاتا ہے۔ اِسی طرح ایک ایک چیز کا نام اور اُس سے متعلق عورت کا نام لیا جاتا ہے۔

صبح کو جب برات چڑھنے لگی تو مَیں گھر میں گیا۔ اور رات کے گیت لکھوانے کی خواہش ظاہر کی۔ چاروں طرف ایک ہجوم ہوگیا اور اتنے گیت مَیں نے لکھ لئے کہ ایک دفتر ہوگیا۔ اِن میں مختلف مختلف موقعوں کے گیت ہیں۔ جھولے کے گیت۔ چرخے چکی کے گیت۔ لوریاں۔ بیاہ شادی کے گیت۔ بیاہ کے موقع کا ایک گیت اور نہایت مزیدار ہے۔ دولھا کے کپڑے رنگے جاتے ہیں۔ تو رنگ کا گیت گایا جاتا ہے۔

کونسے دیسوں سے آیا ۔ نیا رنگ ۔ سدا رنگ
پُورب دیسوں سے آیا ۔ نیا رنگ ۔ سدا رنگ
گھول کٹورے پایا ۔ نیا رنگ ۔ سدا رنگ
کس کے جوڑے چڑھایا ۔ نیا رنگ ۔ سدا رنگ
بنّے کے جوڑے چڑھایا ۔ نیا رنگ ۔ سدا رنگ

سدا رنگ کہہ کر تفاول کیا جاتا ہے۔ اور پورب دیس سے مراد جاپان ہے۔ اگر ناظرین نے چاہا تو آیندہ کسی اشاعت میں دوسری مصروفیتوں کے گیت بھی پیش کرونگا۔ ہندوستان میں زندگی کی ہر حرکت پر ایک گیت موجود ہے۔ بیاہ شادی کے گیت ہی ہزاروں کی تعداد تک پہنچتے ہیں۔ ایک گیت جو بہو کو ڈولی سے اُتارتے وقت گاتے ہیں وہ اور پیش کرتا ہوں۔

دُولھا بھلے ۔ دولھنیں چنگیری[1] ۔ ڈولے جھک جھک آئے
چھوٹے آم ۔ بڑے پھل لاگے ۔ ڈولے جھک جھک آئے
بابل کے گھر بہوویں لائے ۔ ڈولے جھک جھک آئے
جیتم جیت وہ آئے ۔ ڈولے جھک جھک آئے

وقار

[1] چنگی

راحت کدہ

تمہاری یاد میں دُنیا کو ہوں بھلائے ہوئے
تمہارے درد کو سینے سے ہوں لگائے ہوئے

شبِ سیاہ پہ ہیں غم کے ابر چھائے ہوئے
سحر کی آنکھ میں آنسو ہیں ڈبڈبائے ہوئے

ہمارے زخمِ جگر کے ہیں خوشنما پردے
یہ قہقہے، کہ ہیں دُنیائے غم چھپائے ہوئے

بہارِ لالہ و سرو و سمن کو کیا دیکھوں
مری نظر میں ترے جلوے ہیں سمائے ہوئے

جو تجھ سے کچھ بھی نہ ملنے پہ خوش ہیں اے ساقی
کچھ ایسے رند بھی ہیں میکدے میں آئے ہوئے

بہشتِ ذوقِ نظر ہے وہ جلوۂ رنگیں
لبوں پہ موجِ تبسم نظر جھکائے ہوئے

تمہارے ایک تبسم نے دل کو لوٹ لیا
رہے لبوں پہ ہی شکوے لبوں پہ آئے ہوئے

وہ رندِ شوخ کہ دَیر و حرم میں سرکش تھا
ترے حضور میں بیٹھا ہے سر جھکائے ہوئے

اثرؔ بھی راہروِ دشتِ زندگانی ہے
پہاڑ غم کا دلِ زار پر اُٹھائے ہوئے

اثرؔ صہبائی

مایوس مسافر

"ایک اہم کام کے لئے چار ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ جو خودکشی کرنے کے لئے آمادہ ہوں کیپٹن کوجل نمبر ۵ بلینک اسٹریٹ سے علی الصباح چار بجے کے بعد ملکر گفتگو کیجئے۔"

کیپٹن کوجل نے صبح کے شائع ہونے والے تین اخباروں میں مندرجہ بالا اشتہار چھپوا دیا۔ پانچ بجتے بجتے انکے دروازے پر پانچ مرد اور تین عورتیں حاضر ہوگئیں۔ ان میں سے کیپٹن نے ایک نوجوان عورت اور تین مردوں کو منتخب کرلیا۔ باقیماندہ مایوس ہوکر واپس چلے گئے کیونکہ انہیں صرف چار آدمیوں کی ضرورت تھی۔

ان امیدواروں کو ایک بند کمرے میں لے جاکر کیپٹن نے کہا۔

"تمہاری ضرورت مجھے کیوں پڑی؟ سنو! میرا خیال ہے کہ جہاز کے ذریعہ سے یا پیدل چلکر کوئی قطب شمالی تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ وہاں پہنچنا صرف ہوا کے ذریعے سے ممکن ہے۔ اور اس راستے کی سواری کیا ہوگی؟ جانتے ہو؟ غبارہ! غبارے کے ذریعے سے جانے میں جان کا خطرہ ہے۔ لیکن میں نے سوچا ہے کہ جو لوگ خودکشی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بخوشی اپنی جان کو اس خطرہ میں ڈال سکتے ہیں۔ ایک بات اور بھی ہے۔ اس طرح آپ لوگ جان دیکر خودکشی کے گناہ سے بھی بچ سکتے ہیں۔ رفاہِ عام کے لئے جان دینے سے گناہ نہیں ہوتا۔ میرے پاس ایک بہت بڑا غبارہ ہے۔ اس میں آپ لوگوں کے سفر کی تمام ضروریات کا انتظام ہوگا۔ غبارے کو اڑانے والی گیس کم ہونے لگے گی۔ تو آپ لوگ اس میں بیٹھے بیٹھے نئی گیس بھی تیار کرسکیں گے۔

اب کہئے۔ کیا آپ چاروں صاحبان میرے غبارے میں بیٹھکر یہ سفر کرنے کے لئے تیار ہیں؟

چاروں نے ایک ساتھ کہا۔ "ہاں"۔

کیا آپ لوگ ہر حالت میں جان دینے کے لئے تیار ہیں"۔

"ہاں، ہاں!!"

"اچھا تو آپ مجھے اپنا اپنا نام لکھادیں"۔

یہ کہنے کے بعد کیپٹن نے ایک کاغذ پر مندرجہ ذیل نام لکھے۔

ولیم کرٹر۔

ڈاکٹر ہیگن

اڈمنڈ جارنول

میری ڈرمائ

مسٹر کرڈ ساٹھ برس کے بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔ انکی پوشاک بھلے آدمیوں کی سی تھی۔ انکے پر تمکین چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ انہوں نے ہمیشہ عیش و آرام میں زندگی بسر کی ہے۔

ڈاکٹر ہیگن افکار کے باعث دبلے پتلے اور زرد ہو رہے تھے۔ انکی صورت سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ بیمار ہیں۔ اور انکے دل میں خوشی کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہ گیا ہے۔

مسٹر جارنول کے متین چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ وہ بڑے کار آزمودہ ہیں۔ اور ان میں عقل و فہم کی بھی کمی نہیں ہے انکے جسم پر ایک پتلا دوشالا پڑا تھا۔ انکی پژمردہ صورت فکر اور بھوک کی تکلیف کو صاف ظاہر کر رہی تھی۔

کیپٹن نے کہا۔" مجھے امید ہے۔ کہ آپ سب اپنا سفر پورا کرکے صحیح و سلامت واپس آئیں گے۔ لیکن آپ کو یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ قدرت آپ کے خلاف ہے۔ اپنی حفاظت کے لئے میں آپ سے یہ لکھوا لینا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ راستے کی تمام تکالیف کو جانتے ہوئے بھی یہ سفر اختیار کر رہے ہیں۔ پرسوں میں غبارے کو اڑا دینا چاہتا ہوں اس لئے آپ اپنے متعلقین اور احباب سے رخصت ہو کر اس روز ٹھیک تین بجے یہاں تشریف لے آئیں۔

وقتِ مقررہ پر چاروں رضاکار کیپٹن کوحل کے ہاں حاضر ہو گئے۔ وہاں سے وہ کیپٹن کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھ کر شہر کے باہر ایک میدان میں پہنچے۔ میدان میں کیپٹن کا غبارہ درختوں کے اوپر اڑ رہا تھا۔ غبارہ موٹے موٹے رسوں سے بندھا تھا۔ مس ڈرمائ کے علاوہ باقی سب اپنے لئے گرم کپڑے ساتھ لائے تھے۔ ڈرمائ غریب اور بیحد مفلس تھی۔ اسکے پاس ایک پتلے فرشالے کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ کیپٹن نے اپنا اوورکوٹ اور گاڑی میں سے دو کمبل نکالکر اسے دیئے۔

یہ مسافر غبارے میں بیٹھنے جا ہی رہے تھے کہ یکایک وہاں ایک نوجوان آموجود ہوا۔ اس نے کیپٹن کوحل سے کہا "میں بھی اس مہم میں شامل ہونا چاہتا ہوں مجھے بھی غبارے میں چڑھنے کی اجازت دیجئے"

کیپٹن نے جواب دیا۔" یہ بالکل ناممکن ہے۔ تم اس میں نہیں بیٹھ سکتے۔ تم نہیں جانتے کہ ہمارا مقصد کیا ہے"

نوجوان بولا" میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ خودکشی کرنی چاہتے ہیں۔ اسی لئے وطن سے دور جا رہے ہیں۔ میں ان کے ساتھ ضرور جاؤنگا۔

کیپٹن نے قدرے ناراض ہو کر کہا۔ "مگر جناب ...."

نوجوان درمیان ہی میں قطع کلام کر کے بولا۔ "مجھے جانے دیجئے۔ ورنہ میں آپ کے سامنے یہیں جان دیدونگا۔ یہ لوگ زندگی سے اتنے بیزار نہیں ہیں جتنا میں ہوں۔"

ڈاکٹر ہیگن بولے "اسے بھی بیٹھ جانے دیجئے۔ حرج ہی کیا ہے۔

کیپٹن نے کہا "مجھے خوف ہے کہ پانچ آدمیوں کا بوجھ غبارے کے لئے کہیں زیادہ نہ ہو جائے۔

"چاہے جو بھی ہو۔ میں تو جاونگا۔ یہ کہتا ہوا وہ نوجوان غبارے میں سوار ہو گیا۔

کیپٹن کوجل نے ایک افسردہ سانس لی۔ اور کہا "خیر احتیاط سے جانا۔"

نوجوان نے کہا "میرا نام جان وینڈن ہے۔ کوئی پوچھے تو بتا دیجئے گا۔ کہ میں کہاں گیا ہوں۔ لیکن مجھے امید نہیں۔ کہ میرے متعلق کوئی دریافت کریگا۔

کیپٹن نے اس جماعت کو رخصت کیا۔ رسے کھولے گئے۔ اور غبارہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔

غبارے کے مسافر بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے سے بولنے کی کون کہے۔ کسی نے کسی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ غبارے کے نیچے زمین کے قدرتی مناظر کی طرف بھی کسی نے توجہ نہیں کی۔

آخر مسٹر کرٹر نے مس ڈرماٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا تم خودکشی کرنیکا پورا ارادہ کر چکی ہو؟"

مس ڈرماٹ نے جواب دیا "ہاں"۔

مسٹر کرٹر نے کہا "میں بھی مر جاونگا"

مسٹر وینڈن بولے "میں بھی مر جاونگا!"

مسٹر جارنول نے کہا "میں بھی جان دونگا۔"

ڈاکٹر ہیگن نے باوازِ بلند کہا "اور میں بھی مرونگا!"

مسٹر کرٹر نے پھر کہا "قطب سے صحیح سلامت واپس آنے پر بھی میں جینا پسند نہ کرونگا۔"

مس ڈرماٹ نے کہا "اور میں بھی!"

ڈاکٹر ہیگن اور مسٹر جارنول نے ساتھ ہی کہا "اور میں بھی"!

اس گفتگو کے تقریباً ایک گھنٹے تک سب لوگ پھر خاموش بیٹھے رہے!

مسٹر کرٹر نے طلسمِ سکوت کو توڑتے ہوئے کہا ۔۔۔ "اگر میں ستم زدہ نہ ہوتا تو اس نامانوس دنیا کی پرواز کا مجھے بجد

لطف آتا"۔

مس ڈرماٹ نے کہا "میں اتنی ستم زدہ ہوں کہ مجھے کسی بات میں بھی لطف نہیں آسکتا۔ لیکن میں اتنا کہونگی کہ یہ سفر برا نہیں ہے"۔

مسٹر ونیڈن بولے "اگر دل میں کوئی صدمہ نہ ہوتا تو اس سفر کو کون برا کہہ سکتا"۔

ڈاکٹر ہیگن نے قدرے مسرت کے ساتھ کہا "مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں کچھ رو بہ صحت ہو رہا ہوں"۔

مسٹر کرٹر نے مس ڈرماٹ کو مخاطب کر کے کہا "یہ بڑے تعجب کی بات ہے۔ کہ تمہارے اور مسٹر ونیڈن ایسے نوعمر بھی زندگی سے بیزاری ظاہر کریں۔ یہ تو سمجھ میں آسکتا ہے کہ مجھ سا بڈھا کھوسٹ مرنے کی خواہش کرے۔ لیکن تم، تم کیوں مرنا چاہتی ہو"؟

مس ڈرماٹ نے گویا اس سوال کو سنا ہی نہیں۔

ڈاکٹر ہیگن نے گیس کا مسالہ غبارے کی چمنی میں پھینکتے ہوئے کہا۔ "ہم سب ایک ساتھ ہلاک ہونے جا رہے ہیں۔ اس لئے مصیبت میں گرفتار دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے اپنی اپنی مصیبت کی کہانیاں کیوں نہ کہہ ڈالیں۔

مسٹر کرٹر فوراً بول اٹھے "اس موقع پر یہی ہونا چاہیئے۔ اگر آپ لوگوں کی رائے ہو تو پہلے میں ہی شروع کروں"۔

باقی چاروں نے سر ہلا کر منظوری دی۔

مسٹر کرٹر نے کہنا شروع کیا۔ انہوں نے کہا "مجھے زیادہ نہیں کہنا ہے۔ میرے زندگی سے بیزار ہونیکا باعث صرف یہ ہے کہ آرام و عیش و عشرت سے زندگی گذارنے کے لئے میرے پاس کافی دولت ہے۔ دولت سے جتنی قسم کے عیش و آرام خریدے جاسکتے ہیں ان سب کا میں نے لطف اٹھایا ہے۔ اس معاملے میں میں حد سے گذر گیا ہوں۔ لیکن میرا ہاضمہ کچھ ایسا بگڑ گیا ہے کہ کسی طرح درست نہیں ہوتا۔ اس لئے زندگی مجھے بار معلوم ہو رہی ہے۔ بس یہی میری مصیبت کی کہانی ہے۔

ڈاکٹر ہیگن نے کہا "مجھ میں اور تم میں کتنا تعجب انگیز فرق ہے۔ تم بیکار پڑے پڑے نکمے ہو گئے ہو۔ اور میں کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ میں ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھے آرام ملنے سے رہا۔ کام نہ کروں تو کھانا میسر نہ آئے

مس ڈرماٹ نے کہا "میری کہانی بھی تقریباً ایسی ہی ہے۔ نہ میرے پاس پیسے ہیں۔ نہ میرا کوئی دوست ہے کپڑے سینے سے مجھے اتنی یافت نہیں ہوتی کہ شکم سیر ہو کر کھا سکوں۔ فاقہ کشی کی یہ زندگی گذارتے گذارتے ایک مدت ہو گئی میں موت کو ایسی زندگی سے ہزار درجے بہتر سمجھتی ہوں۔

مسٹر جارنول نے کہا "میں ایک مایوس موجد ہوں۔ سالہا سال سے میں ایک ایسا آلہ بنانے میں مصروف تھا جو دھوئیں کو نیست و نابود کر سکے۔ اب وہ آلہ بنکر تیار ہو گیا ہے۔ لیکن میرے پاس اتنے روپے نہیں کہ اسے پیٹنٹ کرا لوں۔ میں بھوکوں مر رہا ہوں کہیں سے امداد کی توقع نہیں۔ اس لئے میں اس پریشانی سے آزاد ہو کر قبر میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

مسٹر وینیڈن نے اپنا قصہ شروع کرنے سے پہلے دو تین بار کھانسکر اپنا گلا صاف کیا۔ پھر کچھ تامل کے بعد انہوں نے کہا۔ "ایک دوشیزہ سے مجھے محبت ہے۔ کل شب اُس نے مجھے مایوس کر دیا۔ اس کے بغیر میں اپنی زندگی بیکار سمجھتا ہوں"

تھوڑی دیر کے لئے سب خاموش ہو گئے۔ پھر ڈاکٹر ہیگن نے کہا۔ "دوستو! غبارہ گر رہا ہے۔ اور مسالہ پھینکو۔ یا اسے سکون و اطمینان کیساتھ سامنے کے میدان میں گر جانے دو۔ میں تو سمجھتا ہوں۔ کہ غبارے کو کسی درخت سے باندھکر شب یہیں گذاری جائے۔ صبح ہوتے ہی پھر سفر شروع کر دیا جائے گا۔ کیوں۔ کیا رائے ہے؟"

اس تجویز کو سب نے منظور کر لیا۔ ڈاکٹر نے رسا پھینکا۔ وہ ایک درخت سے الجھ گیا۔ بدقت تمام اس درخت سے غبارے کو باندھ کر سب لوگ نیچے اُترے۔

یہ بالکل سنسان مقام تھا۔ چاروں مسافروں نے لکڑیاں مہیا کر کے آگ تیار کر لی۔ مسٹر وینیڈن اور مسٹر جارنول کھانا پکانے میں مصروف ہو گئے۔

ڈاکٹر ہیگن اور مسٹر کرٹز مس ڈرمانٹ کی شب باشی کے لئے ٹہنیاں اکٹھی کر کے ایک جھونپڑا سا بنانے کا انتظام کرنے لگے۔

کھانا کھانے کے بعد چاروں آگ کے قریب آ بیٹھے۔ اس وقت اُن کے بُشرے سے کسی قدر خوشی ظاہر ہو رہی تھی۔

مسٹر کرٹز یکایک کہنے لگے "میں بہت دیر سے سوچ رہا ہوں۔ کہ یہ بڑی شرم کی بات ہے۔ کہ مس ڈرمانٹ جیسی نازنین کو بھوکوں مرنا پڑے اور مجھ جیسے بوڑھے کو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ دولت کس طرح خرچ کرنی چاہیئے۔ مس ڈرمانٹ میں سچ کہتا ہوں۔ کہ تم واپس جانا چاہو تو میں تمہیں اپنا سب مال و دولت دینے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے اپنا سارا مال و متاع ایک پاگل خانے کے نام لکھا دیا ہے۔ میں اُسے دوسرے کاغذ پر تمہارے نام لکھ دونگا۔ پہلے کاغذ کا پتہ میں تمہیں بتا دونگا اُسے پھاڑ دینا۔"

مس ڈرمانٹ نے کہا "مگر میں واپس نہیں جانا چاہتی"

مسٹر وینیڈن نے کہا "اگر میں عورت ہوتا تو چلا جاتا۔ مس ڈرمانٹ! یہ دشوار سفر تمہارے لئے نہیں ہے۔ اور مسٹر جارنول! تمہارے لئے میں نے ایک بات سوچی ہے۔ میرے والد لوہے کے ایک دولتمند تاجر ہیں۔ جیسا آلہ تم نے ایجاد کیا ہے۔ بالکل اسیطرح کے آلہ کے لئے انہوں نے اعلان کیا ہے۔ تم ان سے ملو۔ یقیناً مالا مال ہو جاؤ گے۔"

مسٹر جارنول نے کہا "کیا اچھا ہوتا اگر یہ بات مجھے پرسوں معلوم ہوگئی ہوتی۔
ڈاکٹر ہیگن نے کہا "بہت خوب اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مسٹر کرٹر کو معدے کا مرض ہے۔ تو انہیں یہاں نہ آنے دیتا۔ میں اس مرض کا خاص ماہر ہوں۔ مسٹر کرٹر! ذرا انہیں دیکھوں تو ــــــ ہاں میرا خیال ہے کہ تمہیں اچھا کرسکتا ہوں"
مسٹر کرٹر نے کہا "پرسوں صرف تمہاری اس بات سے خوش ہوکر میں تمہیں اپنا نصف مال و دولت دے سکتا تھا"
ڈاکٹر نے کہا "اگر ایسا ہوتا تو اس وقت میں یہاں آتا ہی کیوں"
مسٹر جارنول نے پوچھا "کیا ہم لوگ اب واپس نہیں چل سکتے؟"
ڈاکٹر ہیگن نے کہا "کیسے چل سکتے ہیں؟"
مسٹر وینڈن بولے "آپ لوگ واپس بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن میرے لئے کوئی رستہ نہیں ہے۔
مسٹر کرٹر نے کہا "کیوں؟ اور بھی تو کتنی دوشیزہ نازنینیں ہو سکتی ہیں جن سے تم محبت کر سکو"
مسٹر وینڈن نے ہچکچاتے ہوئے اور مس ڈرماٹ کیطرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں میں جانتا ہوں لیکن ــــ"
مس ڈرماٹ کے چہرہ پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔
ڈاکٹر ہیگن نے کہا "جلدی کیا ہے۔ ہم لوگ شب میں سوتے وقت ان باتوں پر غور کر سکتے ہیں"۔
مس ڈرماٹ ٹہنیوں سے بنے ہوئے جھونپڑے میں سونے کے لئے چلی گئیں۔ باقیماندہ چار اشخاص آگ کے پاس پڑ کر سو رہے۔
صبح ہوئی ناشتہ کرنے کے بعد مسٹر کرٹر نے کہا۔ رات کی باتوں پر خوب غور کرنے کے بعد میں نے یہ طے کیا ہے کہ مس ڈرماٹ، ڈاکٹر ہیگن، اور مسٹر جارنول واپس چلے جائیں۔ اور میرے مال و دولت کو برابر برابر تین حصوں میں تقسیم کرلیں۔ مسٹر وینڈن اپنے والد کو ایک خط لکھ دینگے۔ کہ وہ مسٹر جارنول کا دھوئیں والا آلہ خرید لیں۔ باقی رہ گئے ہم دو شخص میں اور مسٹر وینڈن۔ ہمارا مرض لا علاج ہے۔ اس لئے ہم سفر جاری رکھینگے۔ کیوں آپ لوگ اس رائے کو پسند کرتے ہیں
مسٹر جارنول نے کہا "میں واپس جانے کے لئے تیار ہوں"
ڈاکٹر ہیگن بولے۔ میں واپس جا سکتا ہوں لیکن مسٹر کرٹر! شرط یہ ہے۔ کہ تم بھی چلو۔ میں تمہیں اچھا کر لونگا"
مسٹر کرٹر نے کہا۔ لیکن مسٹر وینڈن کو یہاں تنہا چھوڑ دینا بڑی شرم کی بات ہوگی۔ میں بہت دنوں تک زندہ رہا ہوں میں واپس نہیں جاؤنگا۔ میں سفر پورا کرونگا۔
مسٹر وینڈن نے کہا "مسٹر کرٹر کی گفتگو میں بے شک اثر ہے"۔

پھر ذرا سے وقفے کے بعد کہنے لگا "لیکن"........

مسٹر کرٹر بول اٹھے "کیوں؟ کیا تم بھی واپس ہونا چاہتے ہو؟"

مسٹر وینیڈن نے قدرے شرمندہ ہو کر کہا "میں نہیں جانتا لیکن کل رات میں یہ حساب لگا رہا تھا۔ کہ کیا ایک عورت کی تسخیر کا انتقام انسان کی جان سے زیادہ بھی کچھ ہو سکتا ہے"۔

مسٹر کرٹر نے کہا "تم نے خوب سوچا۔ اچھا تو یوں سمجھو اگر ڈاکٹر ہیگن مجھے اچھا کر دیں گے۔ تو انہیں پچاس ہزار ڈالر نقد دونگا۔ اور چارنول کی ایجاد میں حصہ دار ہو جاؤنگا۔ یا تمہارے والد سے اُسکے متعلق گفتگو کر لی جائیگی۔ اور مس ڈرمانٹ کو اپنی بیٹی بنا کر اپنے یہاں رکھ لونگا"

مسٹر وینیڈن نے کہا "میں ایک اور ہی بات سوچ رہا تھا لیکن وہ شاید آپ کو پسند نہ آئے"

ڈاکٹر ہیگن نے پوچھا "وہ کیا"

مسٹر وینیڈن نے کہا "میں سوچ رہا تھا۔ مگر اس کے کہنے سے کیا فائدہ؟"

مسٹر کرٹر نے کہا "کہو بھی۔ ہم اتفاق رائے سے کام کرنا چاہتے ہیں"

مسٹر وینیڈن نے کہا "میں سوچ رہا تھا۔ کہ اگر مس ڈرمانٹ آپکی بیٹی ہونیکی بجائے میری بیوی بننا قبول کر لیں تو سب کی دلی تمنا ہو جائے۔ کیوں ڈرمانٹ! تمہارے نزدیک یہ تجویز کیسی ہے؟"

مس ڈرمانٹ نے اپنا سر جھکا لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی اہم مسئلے کے حل کرنے میں مصروف ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بولیں "میں اس مسئلہ پر غور کرونگی"۔

مسٹر کرٹر نے مسکرا کر کہا۔ اسکے یہ معنی ہیں۔ کہ مس ڈرمانٹ رضامند ہو جائینگی لیکن میری تجویز یہ ہے۔ کہ جب تک وہ اس معاملے پر غور کر رہی ہیں اس وقت تک میرے ہی ساتھ رہیں۔ کیا آپ سب اسے پسند کرینگے؟"

ہر ایک نے سر ہلا کر اس بات کو منظور کیا۔ اب وہ سب بیحد مسرور معلوم ہوتے تھے۔ اسی اثنا میں مس ڈرمانٹ نے یکایک چلا کر اوپر سر کے اُوپر آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا "ارے وہ کیا ہے"

ڈاکٹر ہیگن نے چونک کر کہا۔ "اف غبارہ ہماری طاقت سے باہر نکل گیا۔ اب اب! ...... اب ...... کیا کیا جائے"

مسٹر کرٹر نے کہا "جانے دو اسکی پروا کون کرتا ہے کیپٹن کوجل کی اسکیم کی ناکامی کا معاوضہ میں ادا کر دونگا۔ اب سوچو کہ گھر کیونکر پہنچ سکتے ہیں۔

مسٹر وینیڈن اور مسٹر چارنول سواری کی تلاش میں گئے۔ جلدی ہی انہیں ایک سواری ملگئی۔ قریب کا اسٹیشن تیرہ میل تھا۔ دو گھنٹے میں وہ یہاں پہنچگئے۔ مسٹر کرٹر ٹکٹ خریدنے لگے۔ اور ڈاکٹر ہیگن نے تار گھر میں جا کر کیپٹن کوجل کو مندرجہ ذیل تار بھیجا۔

"کیپٹن کوجل! غبارہ اڑ گیا۔ ہم لوگ بچ گئے۔ اور خوب خوش ہیں۔ کل صبح گھر پہنچ جائیں گے"۔

(ہنری ہیگن)

محمد امیر اللہ آسی

غزل

دہر کے آلام نے مارا مجھے
گردشِ ایام نے مارا مجھے

دوستی کے نام پر مرتا ہوں میں
دوستی کے نام نے مارا مجھے

حفظِ ننگ و نام ننگِ شوق ہے
حفظِ ننگ و نام نے مارا مجھے

آرزوئے خام اور دورِ شباب
آرزوئے خام نے مارا مجھے

راہ و رسمِ عام کی لعنت نہ پوچھ
راہ و رسمِ عام نے مارا مجھے

دوست کے پیغام کی حسرت رہی
دوست کے پیغام نے مارا مجھے

عشق کا الزام ہے مجھ پر وقارؔ
عشق کے الزام نے مارا مجھے

وقارؔ انبالوی

دُنیائے ادب

ہندی

حسین صُورت

نوکیلے کانٹے بھی تھے، آندھی بھی، اُوپر سے اِندر دیوتا بارش بھی کر رہے تھے لیکن مَیں جا رہی تھی۔ کہاں؟ جہاں دل لئے جا رہا تھا۔

کانٹوں کا راستہ ختم ہو چکا تھا، اِندر دیوتا کا غم بھی کچھ کچھ دُور ہو چکا تھا لیکن اب بھی ہوا بہت سُرعت سے چل رہی تھی، مگر مَیں چلی جا رہی تھی۔ اپنے دل کی حسرت و ارمان پُورا کرنے، من کی چاہ لئے ہوئے۔ کہاں؟ — جانتی ہوں لیکن مُنہ سے نہیں کہونگی۔ اب ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ سُورج دیوتا بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ کبھی سُورج بھگوان جیت جاتے تھے کبھی بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اُنکے آگے آ آکر اُنکی خوشی کو مٹا دیتے تھے مَیں کھیلتی ہوئی جا رہی تھی، جا رہی تھی بس جا رہی تھی، وہیں جہاں میرا خیال تھا۔

آخر مَیں پہنچ گئی۔ اُس مدھوبن میں جہاں تتلیاں میٹھے میٹھے پھولوں پر بیٹھ کر اُن کا رس چُوس رہی تھیں، اور خوشی میں مست ہو کر الاپ رہی تھیں، اپنا میٹھا میٹھا گانا، بھونرے چمپا کے پھُولوں کو چھوڑ کر گلاب کے پھولوں پر بیٹھے بھنبھنا رہے تھے۔ چمپا بھی اپنی زندگی کی آندھی میں جھوم جھوم کر بھونروں کو پاس آنے نہیں دیتی تھی، اور کہتی تھی "آوارہ گرد کہیں کے! جا مجھے تجھ سے نفرت ہے۔ خبردار میرے پاس نہ آنا بے شرم مجھ سے دُور ہی دُور رہ" اور گلاب بھی یہی کہتا۔ بھونرا یہ سب کچھ سنتا اور پھر بھنبھناتا ہوا نرگس کے کومل کومل گال پر جا بیٹھتا۔ نرگس ہنستی اور چمپا کو دیکھ دیکھ کر جھومتی۔ اپنی خوشبُو سے جنگل کے بھُولے بسرے مسافروں کو خوش کرتی، اور اُونچی گردن کر کے راستہ بتاتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے مجھے ہی بلا رہی ہے مَیں اُسکے پاس گئی، دیکھا، نرگس کے چہرے کو خوبصورتی کو، اور سُونگھا اُس کی مہک کو۔ سچ مچ نرگس ہنس رہی تھی!

ہیں! یہ آواز تو میرے اُسی نٹور کی ہے! اس سُندر بن میں؟ ہاں! ہاں! اُسی کی ہے۔ مَیں آواز کو پہچان کر دوڑتی ہوئی جا رہی تھی۔ آخر اس کدم کے پیڑ کو دیکھ ہی لیا جہاں موہن — شیام — مُرلی والا بیٹھا ہُوا اپنی مُرلی بجا رہا تھا! وہ نغمات اُس پر قربان ہو رہے

تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ نیچے آگیا۔ مَیں نے اُسے دیکھا، اُس نے مجھے دیکھا۔
اُس کے ہاتھ میں بانسں کی پوری تھی، میرے ہاتھ میں ایک گُتھی ہوئی پھُولوں کی مالا۔
"تیرے پاؤں میں کانٹے چُبھے ہوئے ہیں۔ دیکھ رہی! خون بہ رہا ہے"
"شیام! بہنے دو۔ لو یہ پھُول مالا پہن لو"
اُس نے سر جھکا دیا۔ مَیں نے ہاتھ بڑھایا۔ غیر ارادی طور پر زبان سے نکلا "میرے زندگی کے مالک، سُکھ کے جیون....

"اری رادھا! او رادھا، اری او رادھا اُٹھ! سوتے سوتے یہ کیا بک رہی ہے۔ نیند کو آگ لگا۔ کس سے بات کر رہی ہے۔ کون ہے تیری زندگی کا مالک، سکھ کا جیون؟"
"لیکن ماتا! وہ کہاں ہے؟"
"اری! کو........ن؟"
فرطِ مسرت سے رادھا کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "وہی ــــ حسین صُورت!

سیّد شرف الحسن آروی

بنگالی

ذوقِ محبت

محبت میرے دل کا اسٹیشن ہے جہاں سے غموں کی گاڑی اکثر گزرتی ہے اور میرا دھڑکنے والا دل ایک آلۂ تاربرقی ہے۔ "مجھے تم سے محبت ہے" یہ اُس کا پیام ہے۔
میرا محبوب ہر وقت ہر لمحہ میرے دل میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں ہر جگہ اُسے دیکھتا ہوں۔ وہ میری آنکھوں کی پتلیوں میں رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مَیں ہر وقت اُسے دیکھتا ہوں۔
مَیں اُسکی آواز سننے کیلئے بہت دُور چلا گیا۔ لیکن آہ! بالکل بیکار۔ جب مَیں واپس آیا تو مَیں نے اُسکو اپنے ہی گیتوں میں سُن لیا۔
تم کون ہو جو ایک فقیر کی طرح اُسے دربدر تلاش کرتے پھرتے ہو؟ آؤ میرے دل میں! اور اُس کے چہرے کو میری آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسوؤں میں دیکھ لو۔

دیوانہ مصطفیٰ آبادی

روسی

وہ بڑھیا

مَیں ایک وسیع میدان سے تنہا گزر رہا تھا۔ یکایک مجھے اپنے پیچھے نہایت سُبک اور محتاط قدموں کی آواز سنائی دی.... کوئی میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔

مَیں نے مُڑ کر دیکھا تو ایک پست قامت، خمیدہ کمر بڑھیا سفید چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی نظر آئی۔ صرف اُس کا چہرہ کھلا ہوُا تھا۔ ایک زرد جھرّیوں والا چہرہ، نوکیلی ناک اور منہ دانتوں سے خالی۔

مَیں اُس کے پاس گیا...... وہ کھڑی ہو گئی۔

مَیں نے پوچھا تم کون ہو؟ کیا چاہتی ہو؟ کیا تم فقیرنی ہو؟ کیا تم بھیک مانگتی ہو؟

بڑھیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ مَیں نے جھک کر اُسکے چہرے کی طرف دیکھا مجھے معلوم ہوُا کہ اُسکی دونو آنکھیں ایک نیم شفاف جھلی یا پردے سے جیسا بعض پرندوں کی آنکھوں میں ہوتا ہے اور جسکے ساتھ وہ تیز روشنی سے اپنی آنکھوں کی حفاظت کرتے ہیں ڈھنپی ہوئی ہیں +

مَیں نے اپنا سوال دُہرایا "کیا تم بھیک مانگتی ہو؟ تم میرے پیچھے پیچھے کیوں آ رہی ہو؟" لیکن بڑھیا نے پہلے کی طرح کچھ جواب نہ دیا، بلکہ صرف اپنے آپ میں ذرا سمٹ کر رہ گئی۔

مَیں اُس کی طرف سے منہ پھیر کر اپنے راستے پر ہولیا۔

اور پھر مجھے یوں معلوم ہوُا جیسے میرے پیچھے پیچھے تلی سبک رفتار میں چوری چوری کوئی چلا آ رہا ہے۔

مَیں نے خیال کیا "پھر وہی عورت ہو گی۔ یہ کیوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتی؟" لیکن پھر مَیں نے دل ہی دل میں کہا۔ غالباً یہ راستہ بھول گئی ہے۔ اور اسے نظر نہیں آتا اس لئے میرے قدموں کی چاپ کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہے۔ تاکہ کسی آباد مقام تک پہنچ جائے۔ ہاں، ہاں، یہی بات ہے"۔

لیکن رفتہ رفتہ ایک عجیب بے چینی سی میرے دل میں پیدا ہو گئی۔ مجھے یوں معلوم ہونے لگا جیسے یہ بڑھیا نہ صرف میرا تعاقب کر رہی ہے۔ بلکہ مجھے کہیں لئے جا رہی ہے۔ مجھے دائیں بائیں وہی موڑتی ہے، اور مَیں بے سمجھے بُوجھے اُسکے اشاروں پر چل رہا ہوں +

مَیں ابھی تک اسی طرح چلا جا رہا ہوں..... مگر دیکھو! میرے سامنے میرے راستے میں ایک سیاہ کھلی ہوئی چیز..... ایک گڑھا سا..... "ایک قبر!" یکایک یہ خیال میرے دل میں ایک بجلی کی طرح کوندا۔ "وہ مجھے یہیں لا رہی تھی"۔

مَیں تیزی سے پیچھے کی طرف مڑا۔ بڑھیا اب پھر میرے سامنے تھی..... ہیں، وہ تو دیکھ رہی ہے!...... اپنی بڑی بڑی ظالم،

بدانڈیش آنکھوں سے..... ایک شکاری پرندے کی سی تیز آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی ہے! ..... مَیں اُسکے چہرے کی طرف نگاہ ڈالتا ہوں، اُسکی آنکھوں کی طرف ..... پھر اُن پر وہی دُھندلا سا پردہ چھا جاتا ہے اور پھر وہ بے نور معلوم ہونے لگتی ہیں .....

مجھے خیال آتا ہے "آہ! یہ بڑھیا میری قسمت ہے، قسمت جس سے انسان کو کہیں مفر نہیں"!

"کہیں مفر نہیں! کہیں مفر نہیں! یہ کیا جنون ہے انسان کو کوشش تو کرنی چاہئے"! اور مَیں ایک دوسری سمت کو بھاگ اُٹھتا ہوں۔

مَیں نہایت تیز جا رہا ہوں ...... لیکن اُن سُبک قدموں کی چاپ میرے پیچھے پیچھے ہے۔ قریب، میرے بالکل قریب ...... اور میرے سامنے پھر وہی تاریک گڑھا۔

مَیں پھر ایک طرف مُڑتا ہوں ...... مگر پھر اُن قدموں کی آواز میرے پیچھے ہے اور تاریکی کا وہ ڈراؤنا دھبا میرے سامنے۔

اور ایک آفت زدہ خرگوش کی طرح بے تحاشا دوڑتا ہوا جس طرف بھی مَیں جاتا ہوں یہ منظر میرے سامنے ہوتا ہے، سامنے!

مجھے خیال آتا ہے "ٹھیرو! مَیں اسے دھوکا دیتا ہوں! مَیں اب نہیں بھاگونگا"! اور یکلخت مَیں زمین پر بیٹھ جاتا ہوں۔

بُڑھیا دو قدم کے فاصلے پر میرے پیچھے کھڑی رہتی ہے۔ وہ خاموش ہے، مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ وہیں ہے۔

اور یکایک مَیں دیکھتا ہوں کہ تاریکی کا وہ دھبا خود بخود دُور سے میری طرف بہتا رینگتا چلا آ رہا ہے!

الٰہی! مَیں مُڑ کر پیچھے دیکھتا ہوں ...... بُڑھیا سیدھی میری طرف دیکھ رہی ہے، اور اُس کا دانتوں سے خالی مُنہ غصہ سے ٹیڑھا ہو رہا ہے۔

کوئی مفر نہیں!

"عِلم و عمل"

انگریزی

کوہستانی دوشیزہ

وہ دیکھو سامنے کے کھیت میں ایک پہاڑی دوشیزہ تنہا فصل کاٹ رہی ہے۔ اور کچھ گنگنا رہی ہے۔ شیریں، اور رُوح پرور نغمے کی دلکش آواز خاموش منظر پر چھائے جاتی ہے! دردناک لَے میں تانیں لگا رہی ہے۔ کبھی وہ ایک عالمِ محویت میں کھو جاتی ہے اور کبھی مست ہو کر گاتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ وہ تنہا فصل کاٹ رہی ہے۔ اور غلّہ کو کاٹ کاٹ کر پُولے بنا رہی ہے۔ آہ! اُس کی زبان پر کتنا دردناک نغمہ ہے۔

پُرکیف وادیوں کے ہر ہر گوشے میں بیقرار نغمے ہیں۔ عرب کے ریگستان میں گنجان درختوں پر بلبل نے تھکے ماندے مسافروں کو اونچے سُروں سے خوش آمدید کہا ہوگا تو ہرگز اس کے راگ میں ایسی مٹھاس نہ ہوگی۔ موسمِ بہار میں ٹاپو کی کوئلوں نے بھی اپنی راگنیوں سے سمندر کی خاموشی کو توڑ کر اس طرح فضا میں تھرتھری پیدا نہ کی ہوگی۔

اُسکی نوا میں عہدِ کہن کے جنگ و جدال کی کہانیاں پنہاں ہیں۔ شاید اس میں جورِ فلک کے شکوے ہیں۔ لہجہ دردانگیز ہے، صدا میں غمناک ہیں، شاید اُسکو ماضی کی داستاں یاد ہو۔ ورنہ اس طرح گا گا کے اپنے غم کو مٹا رہی ہے، یا خدا کو اپنا دُکھڑا سُنا رہی ہے۔ یا ایسا کوئی قدرتی ولولہ خیز نغمہ ہوگا جس کے راگ کی ایک ایک تان انسان کو وجد میں لانے والی ہے۔ اُس کی موسیقی کا مضمون کچھ بھی ہو لیکن اُس کے گیت میں روانی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دلسوز نغمہ کبھی ختم ہونے کا ہی نہیں۔

مَیں نے اُسے سُریلے اور دلکش نغمے گاتے ہوئے سُنا اور کام میں منہمک دیکھا۔ مَیں برابر اُس درد بھرے نغمے کے مزے لیتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی۔

جب میں جی بھر کے وہ ترانہ سُن چکا تو پہاڑیوں کی طرف چلا۔ بالآخر شام ہوگئی۔ اور آسمان پر فرشتوں نے تاروں کے چراغ روشن کرنا شروع کئے۔ اور اب اگرچہ آواز سنائی نہیں دیتی۔ تاہم وہ راگ میرے دل میں سما رہا ہے۔

ایم۔ اے متین

فارسی

پانی

وہ پاک وجود کیا ہے۔ جو پیغمبروں کی رُوح کی طرح ضعیف، لیکن انسان کے دلوں پر فتح حاصل کرنے والا ہے؟ ہلکی مگر قیمتی چادر ہے، زاہد کی طرح نیلے ملبوس میں آراستہ ہے، نیک دل بزرگوں کی مانند رنگ و بُو سے معرّا ہے، کبھی ارزاں ہے۔ کبھی بیش بہا، کبھی نیچے ہے، کبھی اُوپر، کبھی گدلا ہے کبھی بلور کی طرح صاف و شفاف، کبھی درد ہے کبھی دوا، عاشقوں کی یاس بھری آنکھوں اور معشوقوں کے دلفریب چہروں سے نزدیک ہے۔ کمینوں کی آنکھوں اور غریبوں کے چہرے سے دُور ہے۔ مشرق اور مغرب میں سکندرِ اعظم کی تلاش کا مدعا ہے، کربلا کے شہیدوں کی خواہش کا مقصد ہے، جبرائیل کی طرح آسمان سے زمین پر آتا ہے، کبھی مصطفٰے کی طرح زمین سے فلک پر چلا جاتا ہے۔

سرور جہاں رعنا

نقد و نظر

یورپ میں دکھنی مخطوطات

مرتبہ جناب نصیر الدین صاحب

ہاشمی بسائز ۲۲×۲۹ / ۸ حجم سات سو صفحات سے زیادہ۔ کاغذ۔ لکھائی چھپائی بہت عمدہ۔ ملنے کا پتہ ظہیر الدین صاحب۔ تلیہ گوڑہ۔ ترپ بازار۔ حیدرآباد دکن۔ قیمت درج نہیں!

یہ کتاب اردو زبان کی تاریخ کے سلسلے میں ہاشمی صاحب کی بے حد قابل قدر اور شاندار کوشش ہے۔ جو برطانیہ اور فرانس کے کتب خانوں میں سے اُردو ذخائر کی چھان بین سے نادر الوجود مسالہ فراہم کرکے مرتب کی گئی ہے۔ ہاشمی صاحب کا ذوق ان کی دماغ سوزی اور حکومتِ آصفیہ کی فیاضی کا کیا ٹھکانا ہے۔

اس کتاب میں دکن کے ان اہلِ قلم کی تصانیف کا ذکر اور نمونے جمع کئے گئے ہیں جو ابتدائے اُردو سے انیسویں صدی تک ہو گذرے ہیں۔ سال بھر میں اس قدر مسالہ فراہم کرکے ترتیب دینا ہاشمی صاحب ہی کا دل گردہ تھا۔ انہیں افسوس ہے۔ اور بجا افسوس ہے کہ اس سلسلے میں انہیں جرمنی کے کتب خانوں کی دیکھ بھال کا موقع نہ ملا۔ اور کتاب میں یہ افسوسناک کمی رہ گئی۔ لیکن جو کچھ ان سے ہو سکا۔ وہ بھی کوئی معمولی کام نہیں۔

ان مخطوطات سے یورپ کے علمی مذاق اور کتابوں کے رکھ رکھاؤ کا جو اندازہ ہوتا ہے وہ نہایت حیران کن ہے۔ جو کاغذ انہیں ہاتھ لگا سینت کر رکھ لیا۔ اس کے بعد دکن والوں کی الوالعزمی اور شوقِ تحقیق کی داد دینی پڑتی ہے کہ اردو کی خدمت میں وہاں کے راجا پرجا کا شوق کس حد تک بڑھا ہوا ہے۔

اردو زبان جب تک زندہ ہے ہاشمی صاحب کی یہ کوشش اہلِ مذاق سے خراجِ تحسین وصول کرتی رہے گی۔

وقار

تہذیب عمل

مولفہ ملک محمد باقر صاحب نسیم رضوانی ایم اے۔ اِس کتاب میں اخلاقی اور عملی زندگی کے متعلق ایک ایک صفحے کے مختصر مضامین درج ہیں۔ دماغی ترقی اور اصلاح کے لئے نہایت آسان اور موثر اصول بتائے گئے ہیں۔ موضوع کی سنجیدگی کے باوجود پیرایۂ بیان دلکش ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو ایسی کتابیں ضرور پڑھنی چاہئیں۔ حجم ۸۰ صفحات۔ قیمت چھ آنے۔ مہتمم دفتر تذکرہ گجرات (پنجاب) سے طلب فرمائیں۔